

آنای

مرتبہ  
الطاف مشہدی

آنیاں

مرتبہ  
الطاں شہری

تائیری

الطب و الشہد

پبلشرز

لاجپت رائے اینڈ شرٹر چان کتب ہاؤس

باداول

## گیلانی الیکٹرک پریس لائبریری

باہمیام پرنٹر چاپشہر  
سوم پرکاش سانسی  
نے کولکاتی دروازہ الہور سے شائع کی

# انتساب

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لے نام

الطاوی شہری

## فہرست مضمون

شترنج کی بازی	پریم چند	۹
نگے کی موت	کرشن چند رایم لے	۲۳
بادن پتے	حسن عباس	۶۱
یہ مرد	اوپندر ناٹھ اشک	۶۴
چین نگر کے چار بیکار	سدرش	۵۹
صحرا	رنبریں نگہ دیر	۶۱
طلائی نہر	احمد ندیم قاسمی	۱۲۹
نحو	عائشہ خا توں قیسم	۱۳۵
افسانہ نگار	محمد امین شرقی	۱۵۵
شراب و شباب	باری	۱۴۶

پیپرا	انٹر شیرافی	۱۶۲
غالب اور گوئے	حاجی لائق	۱۰۹
ڈیا بھائی	رامند ساگر کا خیری	۱۹۹
چھوول	انٹر انصاری	۲۱۳
گرم کوت	راجندر سنگھ بدی	۲۳۵

# انطہار شکر

میں شروع سے ”ادب برائے ادب“ کافی لف اور ”ادب برائے زندگی“ کا حامی رہا ہوں۔ اور میری شاعری سے بھی زیادہ تر اسی جذبہ کا انعام ہوتا ہے۔ اور تحقیقت بھی یہ ہے کہ اس درج فرمाए ہوں اور مظلوم کش نظم میں وہی ادب، ادب کہلانے کا مستحق ہے۔

جو زندگی کی صحیح ترجمانی کرے۔ جو مزدود دل کی مدد و دل کی بجلیوں سے تیز اور آگ سے زیادہ حرارت رکھنے والا خدا پیدا کرے۔ جو مظلوموں کی زبانوں میں پڑے ہوئے زنجک اور ناول کے مکملے مکملے کر دے۔ اور جو غریبوں کے کافلوں میں باوازِ عیند کے لکشم بھی انسان ہو۔ قدرت کے عظیوں میں تمہارا بھی برابر کا حصہ ہے۔

میں اُس ادب کو ہرگز صحیح ادب سمجھنے پر تیار نہیں جو سرمایہ داروں کی تعیش پسند طبیعتوں کو بدلانے کے لئے معرض وجود میں آیا ہو۔ جو ملکوں کی توجہ اُن کے عربِ ناک حالات سے ہٹا کر زلف در خسار کی طرف منعطف کر دے۔ میرے نزدیک ایسا ادب شخص ”بھیلا دہ“ ہے میں ایسے ادب کو ہندوستانی تصنیفات میں دیکھنا چاہتا ہوں جو سماج کے بھیانک چہبے کو بے نقاب کر دے۔ اور بُٹھے دماغوں کی قائم کی ہوئی قیود کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

یوں تو ہمارے تھکے تھے دماغِ رینہ، اسی میں جا کر بھی تھوڑی دیر کیلئے آلام و افکار کو بھول جاتے ہیں۔ شراب خانوں میں بھی کچھ لمحاتِ عیش و عشرت میں سبر ہو سکتے ہیں لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ ہماری زندگیوں کو مستقبلِ عمر پر آرام و رہنمائی میں کونسا ادبِ مدد و معاون ثابت نہ سکتا ہے تو بلاشبہ وہ ادب، ادب پر اتنے زندگی ہے۔

ایک دوست سے ہے میری خواہش تھی کہ ترقی پسند اور بپس کی کمائیوں کا ایک ایسا مجموعہ کام کے سامنے رکھوں جو صحیح معنوں میں ادب برائے زندگی کا آئینہ دار ہو۔ اور آج شاید میری وہ دیر نیہ خواہش پوری ہو رہی ہے۔ اس لئے منہل کرٹے کرنے میں جن عزیزوں نے مجھے مددی ہے۔ ان میں سے بعض کے نام شکریہ کیا تھا ذیل میں درج کرتا ہوں۔

عائیشہ خاتون قصیعہ کرشن خپیدریم لے۔ احمد ندیم فاسی حسن عباس محمدیں

شہر قپوری دعیفہ

م۔ دسمبر ۱۹۷۲ء

الطاف مشہدی

فیض باغ لاهور

# شطرنج کلبی

پریمچنڈ

## شطرنج کی بازی

فواب و احمد علی شاہ کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ، عیش و عشرت کے زنگ میں ڈوبا ہوا تھا  
چھوٹے بڑے۔ امیر و غریب سبھی زنگ ریاں سنارہتے تھے۔ کہیں نشاط کی محفلیں آرائستہ  
تھیں۔ تو کوئی افیون کی پیکیں کے فرے لیتا تھا۔ زندگی کے ہر ایک شبہ میں زندگی و  
مستی کا زور تھا۔ امور سیاست میں شعروں میں۔ طرزِ معاشرت میں۔ حرف و صنعت  
میں۔ تجارت و تباول میں۔ سبھی جگہ نفس پرستی کی وہا قی تھی۔ (ارا کہیں سلطنت میخواری کے  
غلام ہو رہے تھے۔ شعرا بوسہ و کنار میں مست، اہل حرفہ کلا بتوادھ کپن بنانے میں محو۔ اہل  
سیف تیسری باری میں مگن۔ اہل روزگار سرمه و مسی، عطر دلیل کی خرید فروخت کے دلادوہ  
غرض سارا ملک نفس پر وہی کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ سب کی آنکھوں میں ساغر و جام  
کا نشہ چایا ہوا تھا۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ علم و حکمت کے کن کن ایجادوں میں مصروف  
ہے۔ بر و جھر پر مغربی اقوام کس طرح حادی ہوتی جاتی ہیں۔ اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ بیڑی لڑی  
میں۔ تیسرا دل میں پالیاں ہو رہی تھیں۔ کہیں چوسر ہو رہی ہے۔ پوبارہ کاشور مچا ہوا ہے  
کہیں شطرنج کے معز کے چھڑے ہوئے ہیں۔ وہیں زیر و زبر ہو رہی ہیں۔ زواب کا حال اس  
سے بھی بدتر تھا۔ دہان گتوں اور نالوں کی ایجاد ہوتی تھی۔ خلاف نفس کے نتے نتے لشکے۔ نتے  
نتے نشے سوچے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ فھراخیرات تک کے پیسے پاتے تو روپیاں غریب  
کی بجائے مدک اور چاند دو کے فرے لیتے تھے۔ رہیں زادے حاضر جوابی اور بدلہ سبھی

کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ارباب نشاط سنتے تلمذ کرتے تھے۔ فکر کو جو لام عقل کو رسایا اور ذہن کو تیز کرنے کے لئے شطرنج کیسیاں بھا جاتا تھا۔ اب بھی اس قوم کے لوگ کہیں کہیں موجود ہیں۔ جو اس دلیل کو پڑے شد و مدد سے پیش کرتے ہیں۔ اس لئے اگر مرزا سجاو عملی اور میر روشن علی اپنی زندگی کا بیشتر خدمہ عقل کو تیز کرنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ تو کسی ذمی فہم کو اعتماد کرنے کا موقع نہ تھا۔ ماں جہلما انہیں جو چاہیں، دونوں صاحبوں کے پاس مودوٹی جا گیری تھیں۔ فکر معاش سے آزاد تھے، آخر اور کرتے ہی کیا۔ طلوع سحر ہوتے ہی دنوں صاحب ناشتہ کر کے بساط پر بیٹھ جاتے۔ ہر بچا لیتے۔ اور عقل کو تیز کرنا شروع کر دیتے۔ پھر انہیں جرہ بوقتی تھی۔ کہ کب وہ پر ہوا۔ کب سر پر، کب شام، گھر میں سے بار بار آدمی اُکر کرتا۔ کھانا تیار ہے۔ یہاں سے جواب ملتا تھا۔ چلو آتے ہیں۔ دسترخوان بچھا دے۔ مگر شطرنج کے سامنے قورے میں اور پلاو کے فربے بھی پھیلے تھے۔ یہاں تک کہ باور پچی مجبور ہو کر کھانا کمرے میں ہی کھے جاتا تھا اور دونوں دوست دو فوں کام ساتھ ساتھ کر کے اپنی باریک نظری کا ثبوت دیتے تھے۔ کبھی کبھی کھانا رکھا ہی رہ جاتا۔ اس کی یاد ہی نہ تھی۔ مرزا سجاو عملی کے مکان میں کوئی بڑا بوڑھا نہ تھا۔ اس لئے انہیں کے دیوان خانے میں معمکنہ آرٹیاں ہوتی تھیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کے گھر کے اور لوگ اس مشغله سے خوش تھے، ہرگز نہیں محالہ کے گھر کے نوکر چاکر دیں میں۔ ہر دوں، ہماں دوں، میں بڑا حاصلانہ ہرف بُریاں ہوتی رہتی تھیں۔ بڑا منہوس کھیل ہے، گھر کو تباہ کر کے چھپوڑتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کسی کو اس کی چاٹ پڑے۔ آدمی نہ دین کے کام کا رہتا ہے۔ نہ دنیا کے کام کا۔ لیس اسے دھوی کاٹا۔ سمجھو۔ گھر کا نہ گھٹ کا۔ بُر امر خیز ہے۔ ستم یہ تھا کہ بیگم صاحبہ بھی آتے دن اس مشغله کے خلاف صد اتنے احتیاج بلند کرتی رہتی تھیں۔ تب مرزا جی گھر میں آتے نہ تھے۔ ماں جو لام ہے کاغصہ دار بھی پر اُتارا

کرتی تھیں۔ تو کر دل کو جھپٹ کر پاں دیا تھیں۔ کیا میاں نے پان مانگئے ہیں؟ کہہ دا کر لیا ہیا نہیں۔ کیا پاؤں میں حسندنی بلگی ہوتی ہے۔ کیا کہا ابھی کھانے کی فرصت نہیں ہے؟ کھانا لیوا کر سر پر پٹپاں دو۔ کھاتیں یا کتوں کو کھمدتھیں۔ یہاں ان کے انتظار ہیں کون مجھا بیٹے گا۔ مگر لطف یہ ہے کہ انہیں اپنے میاں سے اتنی شکایت نہ تھی۔ حتیٰ میر صاحب سے۔ وہ میر صاحب کو تکھٹو، بکھڑو، لکڑے خود غیرہ ناموں سے یاد کیا کرتی تھیں۔ شاید مرزا جی بھی اپنی بیت کے اندر میں سارا الزام میر صاحب ہی کے سرڈال دستے تھے چہ۔

ایک دن یہیم صاحب کے سرہی درد ہونے لگا۔ تو ماں سے کہا جا کہ مرزا جی کو بلا لالہ کی حکیم کو بولا ہیں۔ دوڑ جلدی کر سر پھٹا جاتا ہے۔ ماگنی تو مرزا جی نے کھا چل ابھی آتے ہیں۔ یہیم صاحب کو اتنی تاب کہاں کہ ان کے سرہی درد ہوا وہ میاں شطرنج کھیلنے کیا مصروفت ہوں۔ چھروہ سرخ ہو گیا اور ماہنے کے کھا جا کر کہ کہا بھی پہنچتا۔ دردہ دد خود یہیم صاحب کے یہاں پلی جائیں گی۔ کچھ ان کے ہنکھر رہستہ نہیں دیکھتا ہے۔ مرزا جی پڑی دلچسپی اپنے ہی کھیل رہتے تھے۔ دوہی کشتوں میں میر صاحب کی مات ہوتی جاتی تھی۔ بوئے کیا ایسا دم لبؤں پر ہے۔ فراغ پہنچیں آتا۔ یہیم صاحب چھوٹستار کر دیں گے۔ کہ ان کے آتے ہی آتے درد سرفراز ہو جاتے گا۔

میر صاحب نے فرمایا۔ اسے تو جا کر فراہن ہی آئیے نہ اعتریں نازک مزاج ہر قی

تھی ہیں۔

مرزا جی ہاں کیوں نہ چلا جاؤں۔ دو کشتوں میں آپ کی مات ہوتی ہے۔

میر جی اس بھروسے نہ رہتے گا۔ دو چال سوچی ہے کہ آپ کے ہرے دھرے نہیں اور مات ہو جاتے۔ پر جلیتے مُن آئیے۔ کیوں خواہ مخواہ ذرا سی بات کے لئے ان

کا دل دکھیتے گا۔

مرزا：“جی چاہتا ہے اسی بات پر مات کر دوں۔”

میرزہ مصیلوں گاہی نہیں۔ آپ پہنچے جا کر سن آئیں۔”

مرزا：“امے یار جان پڑے گا۔ یکم کے یہاں۔ در در دخاک نہیں ہے۔ مجھے حق

گرتے کا عملہ ہے۔”

میرزہ کچھ بھی ہوان کی خاطر کرنی ہی پڑے گی۔

مرزا：“اچھا ایک چال اور چل لوں۔”

میرزہ ہرگز نہیں۔ جب تک آپ من نہ آئیں گے۔ میں فردوں کو لا تھنڈ لگاؤں گا۔”

مرزا صاحب مجبور ہو کر اندر گئے تو یکم صاحب نے کراہتے ہوتے کہا۔ تمیں نگردا

شدنی خاتما پیارا ہے۔ کہ چاہے کوئی مردی عباتے پڑا۔ لٹھنے کا نام نہیں دیتے۔ شدنی خاتما ہے

کہ میری سوکن ہے۔ نوج کو قی تم جیسا نہ ہیا ہو۔”

مرزا：“کیا کر دوں۔ میر صاحب مانتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکلوں سے مگلا چھڑا کر لیا ہو۔

یکم：“کیا جیسے خود نکھٹو ہیں۔ ویسے ہی دوسروں کو سمجھتے ہیں، ان کے بھی تو بال

پچھے ہیں۔ کہ سب کا سبقا یا کر دیا۔”

مرزا：“بڑا نتی آدمی ہے۔ جب اگر سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ تو مجبور ہو کر مجھے بھی کھیندا

ہی پڑتا ہے۔”

یکم：“دلکار کیوں نہیں دیتے کتنے کی طرح۔”

مرزا：“سبحان اللہ۔ بلا برس کے آدمی ہیں۔ عمر میں رتبہ میں مجھ سے دو انگل اُدپنے

ملاء خلصہ کرنا ہی پڑتا ہے۔”

بیگم۔ تو میں ہی ڈکار سکر دیتی ہوں۔ نا راض ہو جائیں گے جو جائیں۔ کون میری  
روٹیاں چلاستے ہیں۔ رانی روٹھیں گی۔ اپنا سماں لیں گی۔ (مامات) عباسی شترنگ  
اٹھالا۔ میر صاحب سے کہ دینا۔ میاں اب نہ کھیلیں گے۔ آپ تشریف نے جائیں۔  
اب پھر منہ نہ دکھایتے گا!

مرزا ہے ہائیں۔ کہیں ایسا غصب نہ کرنا۔ کیا ذیل کراوی کیا شہر خبری  
لمخت گماں دوڑی جاتی ہے؟

بیگم۔ جانے کیوں نہیں دیتے، میرا ہی خون پتے جو روکے، اچھا اسے روک لیا۔  
مجھے روک لو تو جانوں۔ یہ کہ بیگم صاحبہ خود جھلانی ہوئی دیوان خانہ کی طرف چلیں۔ مرزا جی  
کا چہرہ فت ہو گیا۔ ہوا یاں اٹھنے لگیں۔ بیوی کی منتیں کرنے لگے۔ خدا کے لئے تمہیں  
شمیہ کر بلکی قسم۔ میرنی ہی میت دیکھے۔ جو اورہ قدم دلکھے۔ لیکن بیگم صاحبستے، ایک  
نہ مافی۔ دیوان خانہ کے دروازہ تک گئیں۔ یہاں یک نامحرم کے روپ دبے نہیں بھانتے  
ہوتے پیریں گئے۔ وہیں سے اندر کی طرف جماعت کا۔ حسن اتفاق سے کمرہ خالی تھا۔ میر صاحب  
نے حسب خودرت دو چار متر سے تبدیل کر دتے تھے۔ اور اس وقت اپنی صفائی بتانے  
کے لئے باہر چبوترہ پر چل قدمی کر رہے تھے۔ پھر کیا تھا۔ بیگم صاحبہ کو منہ مانگی مزادی۔ انہے  
پہنچ کر بازی الٹ دی۔ جہرے کچھ تخت کے نیچے پھینکے۔ کچھ باہر تب دروازہ انہی سے  
بند کوئے کنٹھی لگادی۔ میر صاحب دروازے پر نہ تھے ہی۔ جہرے باہر پھینکے جاتے دیکھے  
پھر چلوں کی محبت کاری تیجھوں کے، بیگم صاحبہ بگرگئیں۔ پھیپھے سے ٹھر کی راہیں۔  
مرزا نے بیگم صاحبہ سے کہا۔ تم نے خفیہ کر دیا؟

بیگم۔ اب موادھ رہتے تو کھڑے کھڑے نکال دوں۔ گھر نہیں چکلہ تیجھے دیا ہے۔ اتنی

لوگوں سے لگاتے تو ولی ہو جاتے۔ آپ لوگ تو شطرنج کھیلیں۔ میں یہاں چوٹھے چکلی میں سر کھیاول۔ نوٹنی تجوید کھاتے۔ جلتے ہو یکم صاحب کے یہاں کہ اب بھی ناہل ہے؛ مزراجی گھر سے نکلے تو یکم صاحب کے یہاں کے بدلتے میر صاحب کے ٹھپ پڑھنے۔ تو (صادرت آمینہ بوجہ میں) بادل پُر درد سارا ماجرا کہہ سنایا۔

میر صاحب نہیں کہ بولے۔ اتنا تو یہ اُسی وقت تجوید گیا تھا جب درد سر کا پیغام مالا تھی۔ کہ آج آثارا پچھے نہیں ہیں۔ مگر بڑی غصہ و معلوم ہوتی ہیں۔ اُف! اتنی مکنت! آپ نہ انہیں بہت سرچرچ پسار کھاتے۔ یہ مناسب نہیں۔ انہیں اس سے کیا سطلہ پکھ آپ باہر کیا کریں ہیں۔ خانہ داری کا انتظام کرنا ان کا کام ہے۔ مردوں کی باتوں میں دھل دینے کا انہار کیا مجاز! میرے یہاں دیکھنے کیھی کوئی چوں بھی نہیں کرتا!

درزا۔ ”خیر پہ تو بتائیے اب کہاں جماود ہو گا؟“

میر، اس کا کیا غم ہے۔ اتنا بڑا گھر تھا ہوا ہے۔ بس یہیں جمعے گی۔ مزرا یوں یکم صاحب کو کیسے مناؤں گا۔ جب گھر پہنچا رہتا تھا۔ تب تو اتنی حفلگی گھر سے چلا آؤں تو شاید زندہ نہ چھپ دیں۔ میر اجھی بیکنے دیکھتے۔ دو چار دن میں خود خود سیدھی ہو جائیں گی۔ میں آپ بھی فراں پائیتے۔

— (۳) —

میر صاحب کی یکم صاحب کسی وجہ سے میر صاحب کے گھر سے غائب رہنا ہی پسند کرتی تھیں۔ اس لئے وہ ان کے مشغد تفریح کا مطلق گلہ نہ کرقی تھیں۔ بلکہ کبھی کبھی نہیں جانے میں دیر ہو جاتی، یا کچھ اساتھ۔ تو سر دپستاں یاد رہا ہندن کے حصہ اق انبیاء کا۔

## شطرنج کی بازی

کر دیا کرنی تھیں۔ ان وجہ سے میر صاحب کو گمان ہو گیا تھا کہ میری بیگم صاحبہ نہایت خلیق متحمل مزاج اور عفت کیشیں ہیں۔ لیکن جب ان کے دلوان خانہ میں بساط بچھنے لگی اور میر صاحب کی وائی موجودگی سے بیگم صاحبہ کی آزادی میں ہرج واقع ہونے لگا تو انہیں بڑی تشویش دہنگیر ہوئی۔ دن کے دن دروازہ پچھانکنے کو بھی ترس چاتی تھیں سوچنے لگیں۔ کیونکہ یہ ملا سرستے ہے۔

ادھرنو کر دن ہیں بھی کانا مپھوسی ہونے لگی۔ اب تک دن بھر پر پڑے خڑائے بیٹتے تھے۔ گھر میں کوئی آئے کوئی جائے مان سے مطلب نہیں کہ سرد کا زیست محل سے دو چار فتح بazar جاتا پڑتا۔ اب آٹھوں پہر کی دھونس ہو گئی۔ کبھی پان لگانے کا حکم ہوتا۔ کبھی پانی لانے کا کبھی برف لانے کا۔ کبھی تباہ بھرنے کا۔ حقہ تو کسی دل جیلے عاشق کی طرح ہر دم گرم رہتا تھا۔ سب سے جا کر بیگم صاحبہ سے کہتے حضور میاں کا شطرنج توہارے جی کا جنگال موگیا دن بھر دڑتے دڑتے پیروں دیں چھپا پر پڑ جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی کھیل ہے کہ صحیح کو عینچی تو شام کر دی۔ گھر می دو گھری کھیل لیا، چھٹی ہوئی اور پھر حضور تو جانتی ہیں کہ کتنا منور کھیل ہے۔ جسے اسکی چاٹ پڑ جاتی ہے کبھی نہیں پنپتا۔ گھر پر کوئی نہ کوئی آئت ضرور آتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک لمحے پیچھے ملھے کے ملے تباہ ہوتے دیکھے گئے ہیں ملھے والے ہر دم ہمیں لوگوں کو ٹوکرائتے ہیں۔ شرم سے گز بنا پڑتا ہے۔ بیگم صاحبہ کہیں مجھ تو یہ کھیل خود ایک آنکھ نہیں بجانا۔ پر کیا کر دیں؟ نیڑا کیا لیں ہے؟

محاہ میں دو پار بڑے بوڑھے آدمی تھے۔ وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔ اب خبریت نہیں ہے۔ جب ہمارے رہیوں کا یہ حال ہے۔ تو ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ پسلطنت شطرنج کے ہاتھوں تباہ ہو گی۔ بچن بُجے ہیں۔

مک میں واپسیا مچا ہوا تھا۔ رعایا داں دہارے ملٹی بھتی پر کوئی اس کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ یہاں کی ساری دولت نکھنڈ میں بھی چلی آتی تھی۔ اور یہاں سامان عدش کے بھم پہنچانے میں صرف ہو جاتی تھی۔ بھانڈ، نقال، گتھک، ارباب نشاط کی گرم بازاری تھی۔ ساقزوں کی وکاؤں پر اشرفیاں سستی تھیں۔ رہیں زادے ایک ایک دسم کی ایک ایک اشرافی پھینک دیتے تھے مصاروف کا یہ حال اور انگریزی کمپنی کا قدر روز پر وزیر ہوتا جانا تھا۔ اس کی ادا بیگی کی فکر کسی کو نہ تھی۔ یہاں تک سالانہ ضرایح بھی ادا نہ ہو سکتا تھا۔ روز بیرون بار بار تاکیدی خلوط الکھتا۔ و حکیماں دیباں مگر یہاں لوگوں پر نفس پروری کا فرش سوار تھا کسی کے لام پر جوں تک نہ رکھی تھی۔

خیر میر صاحب کے دیوان فانے میں شترنج ہوتے کئی جہیں گزر گئے۔ بت تھتے نفتش حل کئے جلتے، نئے نئے قلعے تعمیر ہوتے اور سمار کئے جلتے کبھی کبھی کھلے کھینچتے ہیں۔ اس میں جھپڑپ ہو جاتی۔ تو تو میں ہیں کی نوبت پہنچ جاتی۔ پر یہ شکر بجیاں بہت جلد درفع ہو جاتی تھیں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مرزا جی امکھ کر اپنے گھر چلے جاتے۔ میر صاحب بساط اٹھا کر اپنے گھر میں آ جائیتے۔ اور تمہیں کہتے کہ اب کبھی شترنج کے نزدیک نہ جائیں گے۔ مگر صبح ہوتے ہی نہ دوست پھر مل بیٹھتے۔ بندی ساری پدری گیوں کو ودر کر دیتی تھی، ایک دن دونوں احباب بیٹھے شترنج کے ولدی میں غولے کھار ہے تھے کہ شاہی رسالہ کا ایک سوار دردی پہنچنے آئی۔ میر صاحب کا نام پوچھتا آپ ہمچا میر صاحب کے ہوش اڑتے۔ اوسان خطا ہو گئے۔ خدا ہانے کیا بلا صرپا تھی۔ گھر کے دروازے بند کر لئے اور لوگوں سے کہا۔ کہہ دو۔ گھر میں نہیں ہیں۔

سوار نے پوچھا۔ گھر میں نہیں ہیں تو کہاں ہیں۔ کہیں جھپٹے بیٹھے ہوں گے۔

## شطرنج کی بازی

خدمتگار: "یہ میں نہیں جانتا۔ گھر میں سے بھی جواب ملا ہے۔ لیا کام ہے؟  
سوار: "کام بچھے کیا تباوٹ چنور میں طلبی ہے۔ شاید فوج کے لئے کچھ سپاہی  
مانگے گئے ہیں۔ جاگیردار ہیں کہ مذاق ہے۔"

خدمتگار: "اچھا تشریف لے جائیے۔ کہہ دیا جائیگا۔"

سوار: "کہنے سننے کی بات نہیں ہے۔ میں کل فوراً آؤں گا اور تلاش کر کے  
لیجاؤں گا۔ اپنے ہمراہ حاضر کرنے کا حکم ہوا ہے۔"

سوار تو چلا گیا۔ میر صاحب کی روح فنا ہو گئی۔ کانپتے ہوتے مرزا جی سے بے۔ اب کیا ہو گا؟  
مرزا: "بڑی محیبت ہے۔ کہیں میری طلبی بھی نہ ہو۔  
میر کمیت کل پھرآنے کو کہہ گیا ہے۔"

مرزا: قہر آسمانی ہے۔ اور کیا۔ کہیں سپاہیوں کی مانگ ہوئی تو بن موت مرے۔  
یہاں تو جنگ کا نام سُنتے ہی جوڑی چڑھاتی ہے۔

میر: یہاں تو آج سے فانہ پافی حرام سمجھتے۔

مرزا: میں یہی تدبیر ہے کہ اس سے بٹئے ہی نہیں۔ دونوں آدمی فائیب ہو جائیں۔ سارے  
چھانتا پھرے کل سے گومتی پاپکی دلیزی میں نقشہ جمے دیاں کئے جزوں گی خیرت اپنا سامنہ لیکر لوٹ جائیں گے۔  
میر: میں بس آپ کو خوب سمجھی۔ واللہ کل سے گومتی پاپکی تھیرے۔"

اوھر بگم صاحب سوار سے کہہ دی تھیں تم نے خوب بروپ بھرا۔

اس نے جواب دیا۔ ایسے گاؤ دیوں کو تو چکیوں پر پھانا ہوں۔ اس کی ساری عقل اور بت  
تو شطرنج نے چرلی۔ اب دیکھ لینا جو جسمی بھول کر بھی گھر رہے۔ صحیح کالیا پھرات کو آئے گا۔  
اس دن سے دلوں دوست منادر پھرے گھر سے نیل گھر سے ہوتے۔ اور بغل میں

ایک بچپوئی تھی وری و باتے۔ ڈبے میں گلوریاں بھرے، گمنتی پار ایک پڑانی و پرانی مسجد میں  
جا بیٹھئے۔ جو شابید عہد غلبیہ کی یاد کارخی راستہ میں علم، متابکو، مدریاں لے لیتے اور مسجد میں  
پہنچ، دری سمجھا۔ حقہ بھر کر بساط پر جا بیٹھتے۔ پھر انہیں میں و دنیا کی فکر نہ رہتی تھی کہ شہ  
شہ پیٹ لیا۔ ان الفاظ کے سوا ان کے منہ سے اور کوئی کلمہ نہ نکلتا۔ کوئی چدکش بھی  
اتھے استغراق کی حالت میں نہ بیٹھتا ہو گا۔ دوپھر کو جب بھوک معلوم ہوتی تو دنوں  
حضرت گلبوں میں ہوتے ہوئے کسی نام بائی کی دکان پر کھانا کھا لیتے اور ایک چشم  
پی کر پھر منظر بجای کبھی کبھی تو انہیں کھانے کی بھی سردھونہ رہتی تھی۔

ادھر ملکہ میں سیاسی چیزیں پیدگیاں روز پر روز پیدہ نہ ہوتی جاتی تھیں کمپنی کی فوجی  
لکھنؤ کی طرف بڑھی جلی آتی تھیں۔ شہر میں بچل مچا ہوا تھا۔ لوگ اپنے اپنے بال پھوٹ کو  
بیکر دیہاتوں میں بھائے جا رہے تھے۔ پر بھارے دلوں شطرنج باز دوستوں کو عزم زدہ  
اور عزم کالا سے کوئی دامتہ نہ تھا وہ گھر سے چلتے تو گلبوں میں ہو جاتے کہیں کبھی  
کی ملکاہ نہ پڑ جائے۔ ملے والوں کو بھی ان کی صورت و کھانی نہ دیتی تھی۔ پہاں تک کہ انگریزی  
وجہیں لکھنؤ کے قریب پہنچ گئیں۔

ایک دن دنوں احباب بیٹھے بازی کھیل رہے تھے میر صاحب کی بازی کچھ کمزور  
لکھی میزا صاحب کشت پکشت دے رہے تھے کہ دفتار کمپنی کی فوج سامنے رکھ پرسے آتی ہوئی  
و دنیا کی دی کمپنی نے لکھنؤ پر تصرف کرنے کا فیصلہ کر دیا تھا۔ قرض کی عدت یہی سلطنت میضم کر لینا چاہتی  
تھی۔ وہی مہاجنی چال چلی جس سے آج ساری کمزوری میں پاپ زخمی ہوئی ہیں۔  
میر صاحب: انگریزی وجہی آرہی ہیں۔

مرزا: آئے دیکھنے کشت بچائیے۔ کشت یا

## شطرنج کی بازی

میرزا "دراد بکھنا چاہیے۔ آڑ سے دیکھیں کیسے فویں ہیں جوان ہیں۔ دیکھ کر سینہ تھرا آتا ہے۔"

مرزا "دیکھ بیجے گا۔ کیا حبل دی ہے۔ پھر کشت؟"

میرزا "توپ خانہ بھی ہے۔ کوئی پانچہزار آدمی ہونگے۔ شرخ چہرہ جیسے امال نہ رہے۔"

مرزا "جناب جیسے نہ کچھ بیجے۔ پکشت؟"

میرزا "اپ بھی عجیب آدمی ہیں جیسا تو تھی۔ شہر کا محاصرہ ہو گیا۔ تو گھر کیسے چلیں

گئے؟"

مرزا جب گھر چلنے کا وقت آئے گا تو دیکھی جائے گی پکشت اور مات" فوج نکل گئی۔ یاروں نے دوسری بازی بھاپا دی۔ مرزا جی بولے۔ آج کھانے کی کیسے رہے گی؟"

میرزا تھج روڑہ ہے۔ کیا اسپ کو زیادہ بھوک لگی ہے؟"

مرزا "جی انہیں شہر میں نہ معلوم کیا ہوا ہو گا؟"

میرزا شہر میں کچھ نہ ہوا گا لوگ کھانے سے فارغ ہو کر آرام کر رہے ہوں گے حصہ رہا۔ عالم بھی کسٹر احت فرماتے ہوں گے۔ پاشا یہ ساغر کا دُور چل رہا ہو۔

اب کی دلوں دوست کھیلنے بیٹھے تو تین بیج گئے۔ اب کی مرزا جی کی بازی کمزور تھی۔ اس اثناء میں فوج کی دالپی کی آہٹ ملی۔ تو اب واحد علی شاہ معزول کر دئے گئے تھے۔ اور فوج انہیں گرفتار کئے لئے جاتی تھی۔ شہر میں کوئی ہنگامہ نہ ہوا۔ نکشت و خون، یہاں تک کہ کسی جان باز نے ایک فظر و خون بھی نہ بہایا۔ تو اب گھر سے اس طرح خصت ہوتے جیسے لڑکی روپی پیٹی سرال جاتی ہے۔ پہیں روپیں، نو اپنے

ماما بیم مغلانیاں روئیں اور بس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اذل سے کسی مکہ میں کسی بادشاہ کی مزدیلی اتنی صلح آبینہ رکھنے بے ضرر نہ ہوئی ہوگی۔ کم از کم تاریخ میں اسکی نظریہ نہیں پڑھا اہنسانہ تھی، جس پر مانگنے خوش ہوتے ہیں۔ یہ وہ لپٹتہی، وہ نامردی تھی، جس بپر دلپوریاں رفتی ہیں۔ لکھنؤ کا فرماں رو اقبالی بن اچلا جانا تھا اور لکھنؤ عیش کی نیزدیں مست تھے۔ یہ بیاسی زوال کی انتہائی حد تھی۔

مرزا نے کہا۔ "حضور عالیٰ کو ظالمون نے قید کر لیا ہے۔"

میر" ہو گا آپ کوئی قاضی ہیں۔ یہ لیجئے شہ۔"

مرزا۔ "حضرت ذرا مطہر ہے۔ اس وقت بازی کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی حضور عالیٰ خون کے آنسو رو تے جلتے ہوئے۔ لکھنؤ کا چراغ آج ٹھیک ہو گیا"۔  
میر" رو بیا ہی چاہیں۔ یہ عیش قید فرنگ میں کہاں مل میر یہ شہ۔"

مرزا کسی کے دل ہمیشہ را بربنہیں جاتے کہتنی سخت مصیدت ہے۔ بلا ہے آسمانی۔" میر" ہاں سمجھ ہی پھر کشت۔ میں دوسرا کشت بیس مات ہمنجھ نہیں سکتا ہے۔ مرزا۔ "آپ بڑے بے دد ہیں۔ واللہ۔ ایسا حادثہ بانکا، دیکھ کر آپ کو صدمہ نہیں ہونا۔ ہے حضور جان عالم کے بعد اب کمال کا کوئی قدر دان ذر ہا۔ لکھنؤ پر ہو گیا۔"

میر" پہلے اپنے بادشاہ کی جان بچائیے۔ پھر حضور پر لوز کا مانم کچھ بیکشت اور مات، لامانا تھا۔"

ذواب کو لئے ہوئے فوج سلمانے سے نکل گئی۔ ان کے جلتے ہی مرزا جس نے شئ بادی بچا دی۔ ہار کی چھٹ بڑی ہوتی ہے۔ میر صاحب نے کہا۔ آئیے ذواب صاحب

## شطرنج کی بازی

کی حالت زار پر ایک مرثیہ کہہ ڈالیں۔ لیکن مزاجی کی وفاداری اور اطاعت شعرا یہی اپنی ہار کے ساتھ فائز ہو گئی تھی۔ وہ نیکست کا انتقام لینے کے لئے بے صبر ہوا ہے

~~~~~ (۳) ~~~~

شام ہو گئی مسجد کے گھنڈر میں چمگا درڑوں نے اذان دنیا شروع کیا۔ ابا بلیں اپنے اپنے گھولنڈوں سے چمٹ کر نماز مغرب ادا کرنے لگیں پر دونوں کھلاڑی ہازی پر ڈلے ہوئے رہتے۔ گویا دو خون کے پیاس سے سور ماوت کی بازی کھیل رہے ہیں۔ مزاجی متواتر تین باریاں ہار لے کر رہتے۔ اب چونھی ہازی کا نگہ بھی اچھا نہ تھا۔ وہ بار بار جتنی کاشتغل ارادہ کر کے خوب سنبھل سنبھل کر طبعیت پر خوب زور دے کر کھیندے رہتے لیکن ایک نہ ایک چال اسی خراب پڑھاتی رہتی۔ کہ ساری ہزاری ہزاری ادھر پر صاحب غرب میں ڈھنڈتے رہتے یہ ٹھہریاں لگاتے رہتے چلکیاں لیتتے رہتے۔ آواز رکتے رہتے صلح اور جگدت میں کمال دکھاتے رہتے۔ ایسے خوش رہتے گویا کوئی دشمنہ ہا نہ آگیا ہے مزاحنا ان کی یہ خوش فعلیاں مُسُن کر جس بھلا تے اور بار بار تیوری چڑھا کر رہتے۔ آپ چال نہ تبدیل کیا کیجئے یہ کیا کہ چال چلے اور فرآبدل دی۔ جو کچھ کرنا ہوا۔ ایک بار خوب خوز کر کے کیجئے سجناب آپ مہرے پرانگلی کبوں رکھتے رہتے ہیں۔ مہرے کو بے لگ کچھ ڈر دیا کیجئے جب تک میں چال کا فیصلہ نہ ہو جائے مہرہ کو ہاتھ نہ لگایا کیجئے حضرت آپ ایک ایک چال آدھا آدھ کھنٹے میں کبوں چلتے ہیں۔ اس کی سند نہیں جس کی ایک چال میں پانچ منٹ سے زیادہ لگیں۔ اس کی مات سمجھی جائے پھر اپنے چال پہلی۔ مہرہ دیں رکھ دیجئے۔

میر صاحب کافر زمیں ٹپا جاتا تھا۔ پر لے "میں نے چال چلی کب تھی؟"

مرزا: آپ کی چال ہو چکی ہے جنہیں اسی بیس ہے کہ میرہ اسی گھر میں رکھ دیجئے۔  
میرا: اس گھر میں کیوں رکھوں؟ میں نے اس میرے کو ہاتھ سے چھوڑا کر تھا۔  
مرزا: آپ قیامت تک میرے کو نہ چھوٹیں تو کیا چال ہی نہ ہوگی۔ فرزیں  
پڑھنے دیکھا تو دھاندلی کرنے لگے۔

میرا: دھاندلی آپ کرتے ہیں۔ ہماری حیثیت تقدیر سے ہوتی ہے۔ دھاندلی کرنے  
سے کوئی نہیں جنتا۔

مرزا: یہ بازی آپ کی مات ہو گئی۔

میرا: میری مات کیوں ہونے لگی؟

مرزا: تو آپ میرے اس گھر میں رکھ دیجئے۔ جہاں پہلے رکھا تھا۔

میرا: دہاں کیوں رکھوں نہیں رکھنا۔

مرزا: آپ کو رکھنا پڑے گا۔

میرا: ہرگز نہیں۔

مرزا: رکھیں گے تو آپ کے ذریعہ آپ کی حقیقت ہی کیا ہے؟  
بات بڑھ گئی۔ دو دوں اپنی ٹیک کے دھنی بختے۔ نہ یہ دبتا تھا۔ نہ وہ  
منکار میں لا محالہ غیر متعلق باتیں ہونے لگتی ہیں۔ جن کا مشاذ لیل اور خوبیت  
کرنا ہوتا ہے۔ مرزا جی نے فرمایا۔ اگر خاندان میر کسی نے شظر بخ کھیلا ہوا تو آپ  
آئیں اور فلٹ سے واقف ہوئے۔ وہ پہبیشہ گھانس چھپیلا کئے۔ آپ کیا کہا کہ شظر بخ کھیدنے  
بیاست شے دیگر ہے جاگیر مل جانے سے کوئی رتبہ نہیں ہو ساتا۔

میرا: گھانس آپ کے ابا جان حصیتے ہوں گے۔ پہاں تو شظر بخ کھینچنے پڑا۔

اوپر پتیں گزر گئیں۔“

مرزا۔“ اجی جائیے! نواب غازی الدین کے یہاں۔ باورچی گردی کرنے کرنے عمر گزرا گئی۔ اس طفیل میں جائیں پاگئے۔ آج رہیں جنتے کاشون چڑایا ہے رہیں بننا دل لگی نہیں ہے۔“

میرزا کیوں اپنے بزرگوں کے منہ پر کالکھ لگا رہے ہو۔ وہی باورچی رہے ہوئے ہمارے پریگ تو نواب کے مستر خوان پہنچتے تھے۔ سہم فوالہ وہم پیالہ تھے۔“

مرزا شے جیاؤں کو شرم بھی نہیں آتی۔“

میرزا نبان سمجھا لئے درنہ برا ہو گا۔ یہاں اسی باتیں مشنے کے عادی نہیں ہیں کسی نے آنکھ دکھاتی اور سہم نے دیا تلا ہوا ہانخ۔ ہبندار کھل گیا۔“

مرزا۔ آپ ہمارے حوصلے دیکھیں گے۔ تو سجنصل بجائیے۔ تقدیر یا اگرامی ہو

جلتے ادھر پا ادھر۔

میرزا آ جاؤ۔ تم سے دنیا کوں ہے۔“

دولوں دوستوں نے کرسے تواریں نکال لیں۔ ان دونوں اوتے اور اعده اس بھی کٹار بخچر پیش قبض۔ شیر بچپ باندھتے تھے۔ دونوں عدیش کے بندھتے تھے مگر بے عیزت نہ تھے۔ قومی دلبری ان میں عنقا نہی۔ مگر ذاتی دلبری کوٹ کوٹ کریٹ ہوئی تھی انکے سیاسی جذبات فنا ہو گئے تھے۔ بادشاہ کے لئے سلطنت کے لئے۔

قسم کے لئے کیوں مریں؟ کیوں اپنی بھی بندید میں خلیل ڈالیں۔ مگر انفرادی جذبات میں مطلق خوف نہ تھا۔ بلکہ وہ قوی تر ہو گئے تھے۔ دونوں نے پنیریے بدالے۔ لکھنی اور گلکنڈ کھیلے ہوئے تھے۔ تواریں چکریں۔ جھپپا جھپپ کی آواز آئی اور دونوں رحم کھا کر

گھر پہنچے۔ دونوں نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اپنے بادشاہ کے لئے جن کی آنکھوں سے ایکسہونڈ آنسو کی نہ گئی۔ انہیں دونوں آدمیوں نے نظر بخ کے وزیر کے لئے اپنی گردبیس کٹا دیں:

اندھرا ہو گیا تھا۔ بازی بھی ہوئی تھی۔ دونوں بادشاہ اپنے اپنے تخت پر ڈنے افراد رکھتے۔ ان پر حضرت چھائی ہوئی تھی گویا مفتولین کی موت کا مانع کر رہے ہیں، چاروں طرف سنائی کا عالم تھا۔ کھنڈر کی بو سیدہ دیواریں اخستہ حال کنگرے اور سر بجود مباراں لاشوں کو دیکھتے تھے اور انسانی زندگی کی بے شاختی پر افسوس کرتے تھے جس میں سنگ خشت کا ثبات بھی نہیں:



# شمع کی نوت

کرشن چند رایم لے

ساگرہ کے پوڑھے نبی دار نے بارہ سال تک مر جمی کے لڑکے کی پروارش کی۔ اس نے بھال مہربانی رڑکے کا نام گلاب رائے رکھا۔ لیکن اگر وہ اس کا نام ہو، پہنچو، پندرہ یا گھاسی رام رکھ دیتا۔ تو اسے منع کرنے والا کون تھا یہ تو اسکے شریفین الطبع ہونے کی بہترین دلیل تھی کہ اس نے ایک عجیب رڑکے کی بارہ سال تک پروارش کی اور اس کا نام گلاب رائے رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ لڑکا گلاب کی طرح ہی خوش نگ اور حسین تھا۔ اور اس کے چہرے اور ہاتھ کی انگلیوں میں اپنی ماں کے جمالی حسن کے بہت سے اوصاف پائیے جاتے تھے۔ لیکن جیسا کہ دنیا کے ہر ایک ادیب اور شاعر نے کہا ہے کہ حسین چہرے عورتوں کو ہی زیب دیتے ہیں یا ان ابیر لوجوالوں کو جنہیں زلنجاؤں کے عشق میں مرنے کے لئے ہزاروں موقعے ملتے ہوں۔ وقت بھی ہو، اور وافر پیسے بھی ہو۔ لیکن گلاب رائے تو ایک عجیب لڑکا تھا۔ ایک عزیب کسان کا بچہ جس کی جیشیت گاؤں میں پوڑھے نبی دار کے ایک کمیں سے بڑھ کر نہ تھی۔ غریب عورت میں خوبصورت ہو تو بازاروں میں بکھاتی ہے۔ وہ ایک نفع دینے والی شے ہے لیکن غربوں کے مٹپوں میں خوبصورتی ایک بیکاش ہے۔ بلکہ اکثر مرفت رسان بھی۔ کیونکہ بازار میں تو کسان بچوں کے بازوؤں کی قیمت اور جھانی کا زندہ پکتا ہے۔ اور جن کے پاس یہ دونوں چیزیں کم ہوتی ہیں، باکام ہو جاتی

ہیں انہیں پیٹ بھر کر روٹی نہیں مل سکتی۔ یہ سلح کا ایک سیدھا سارہ اصول ہے جس پر غور کرنے کی چند اس ضرورت نہیں اور یہ تو گلب رائے کی خوش فہمی نہیں کہ اس کے کردار میں نسبت کی جھلک نہیں ہونے کے باوجود اسے دلوں وقت پیٹ بھر کر روٹی مل جاتی نہیں۔

پہلے پہل جو کام اسے بوڑھے نبڑا رنے پیر کیا تھا۔ وہ چند اشکل بھی نہ تھا۔ اور اب جب گلب رائے کبھی ان دلوں کو باد کرتا۔ تو وہ اسے اپنے ماضی کے حسین نیزیں لمحے معلوم ہوتے وہ دن کو بوڑھے نبڑا رکار پوڑسر کاری رکھیں یعنی اخلاق جہاں گائیں چھینیں اور بھرپور نکریاں چراتا ایک بہت بڑا جرم تھا۔ لیکن ساگرہ اور ویگ پہاڑی موضع میں جو پہاڑوں کی ڈھلانوں پر آباد تھے۔ اور جہاں زمین فی کس اس قدر کم تھی کہ سال کا افضل ضرورت زندگی کا کفیل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں روشنیوں کے لئے کسان لوگ اپنے کھینتوں میں سے چراگاہیں کیسے بناسکتے تھے۔ سرکاری رکھیں بھی پوڑوں کے لئے بند نہیں۔ اس لئے محض حالات سے مجبوڑ ہو کر وہ سرکاری قانون کی خلاف وزی کرتے رہتے تھے۔ درستہ ان ہی کسی شرطیانی قوت بآگتا ہے کی قوت کا داخل نہ تھا۔ گلب رائے بوڑھے نبڑا رکار پوڑوں بھر کے میں چراتا خواہ خوبیت دیواروں کے پیچے پلی ہوئی ہری ہری پلی گھاس دودھیجیے والے چوپالیوں کے لئے بہت عمدہ تھی اور کہیں کہیں ان دیواروں کے چھتاروں نئے چھوٹے چھوٹے قدرتی مرغزاریں گئے تھے۔ جہاں گاؤں کے چوڑا ہے اور چڑا ہیاں لگتے ہو کر کھیلا کر رہتے تھے۔ چھوٹے سال سے پندرہ سو لہ سال تک کے رکے اور رڑکیاں اسی قدرتی مکتب میں بیم پانے تھے۔ وہ درختوں پر پندرہوں کی طرح چڑھنا پسکے

جانے۔ اخزوں سے نشانہ لگاتے، گپڑا، سوڑ، فرگوش اور دیگر خلکی جانوروں کیلئے زمین میں ایسے خوفناک ڈر لے تیار کرتے کہ جہاں کہیں کسی دندے نہ لے پر پاؤں رکھا دیں۔ ڈر لے میں اسکی طانگ لمحبی رہ گئی۔ اب وہ ہزار چھڑا ہے۔ لیکن ڈر لے سے کہاں جھپڑ سکتا تھا۔ دوسرے دن چرولے ڈر لے میں بھنستھے دندے کو دیکھتے اور کھسرا کا وہ اکٹھا ہو جانا۔ گپڑا اور سوڑ تو فوراً ہلاک کر دیتا۔ کبودنکہ یہی دو جانور حصل کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور پیارے پیارے خرگوش چرواحوں کیلئے لجپ پکھلوانے بن جاتے۔ لیکن گلاب کو ڈر لے بناتے میں مزانہ آناندا۔ ہاں اب دو آہستہ آہستہ بیویوں کی تنلیمہ ذریتیت سے خوب اقت افت ہو گیا تھا۔ اور انہیں کھار کھنے جعل ہیں منتظر کر دیتے اور خطرے کے وقت پھرالیں اپنے پاس ملا لیتے کی تکبیلوں سے اب دو خوبی آگاہ ہو گیا تھا۔ وہ بنسری اور العونے بجاتے ہیں بھی ماہر ہو گیا تھا۔ اور دو پیر کے وقت جب سوچ کی کرنیں اور چپڑوں کے نیچلے پتوں کے ہلتے ہوئے بزر گھاس پر ایک لفڑی شطرنج بن دیتے اور بیویوں کی سماں بیویوں کے بارے سے بند ہوئی جانیں اور چرواہے اور چرواحیاں مختلف کھبیلوں سے تنگ آگئے ہوتے اس تو گلاب کی بنسری کا سہری نغمہ ان بیویوں کے ماتوں کو ایک ہمیٹی مذہبیتی کے روپی مرغدار میں لے جانا۔ نوجوان چرواحیوں کی نگاہیں فضایاں میں ان لوگوں مردیں بہج تراشنے لگتیں اور چرواہے کنکھیوں سے اپنی اپنی محبوب چرواحیوں کی طرف نکلتے۔ اس وقت چرواحیوں کے سخت اور کھڑے ہاتھ انہیں شیم کی طرح ملامم اور صاف معلوم ہو جائے۔ میں پڑی ہوئی چاندی کی بہسلی شعلے کی طرح تپتے نگئی۔ ہمکھیوں میں محبت کی ملامت اور تما نتے ہوئے سرخ رخساروں پر شرم کی نی آجائی۔ پریشیاں اور

عطر و حوشبو سے نا اکشنا بالوں کا ہر زیجح ایک شہری صلقوہ بن جانا۔ لڑکپن اور جوانی کے درمیانی وقفعے کی الگت بیس ثواب کی سی امدادت جنسی، اور سخنیہ کاری توہینیں تھیں۔ لیکن اسکی کمی کو ایک الھڑا مخصوص شعریت پورا کر دئی۔ اسکے نفعے کے بہاؤ میں ہر تو جان چڑھا ہے اور چروہی کا دل جھکپٹے لینے لگتا۔ زندگی کا ہر تاریخ مرض ہو جانا اور گلاب کی نیزی کی دھمی کے ساتھ کسی چروہا ہے کی آواز جنگل کو اپنی ملیٹی اُداسی سے بھر دیتی۔

اس طرح مبیٹے نغموں اور مینبد کی بلکی بلکی مدہوشبوں کے درمیان جہان حققت اور خواب کی صوبیں مل جانی تھیں، دوپہر کندر جاتی، اور رپورٹ پھر چرانے لگتا۔ چروہے انگڑا بیان لے کر اٹھتے اور چپ پایوں کی ملیٹی پر بلکے بلکے سونے مار کر ان کی ملیٹی کو سہلا کے اور اپنی مدہوشی کو ڈور کر کے بھر کسی حصے کے نکارے چلے جلتے جس کے عکس میں چروہا بیسا اپنے چہرے صاف کرتیں۔ ہاتھ اور پاؤں دھو نہیں اور اکثر جھوک کر دوہ پنڈوں کے لئے اپنا چہرہ حصے کے صاف پانی میں چھپا کر اپنی آنکھیں کھوں دیتیں۔ تو انہیں ایک عجیب دنیا نظر آتی چھٹے کی تہ بیس ہر انکار ایک ہیرے اور جواہر سارا شاہا مل معلوم دیتا۔ مینبد کوں کے جسم چھپل کر خوفناک دیوبین جاتے۔ پانی میں اُلی ہوئی گھاس ایک شہر جنگل کی صورت اختیار کر لیتے اور سورج کی تر ترنے ہوئے علاقے شہری اور روپی میدان بن جاتے۔ جہاں پانی کی پریاں سب انسانوں کی نگاہوں سے بچ کر ناچا کر فی تھیں چروہے حصے سے نکلتے ہوئے چھوٹے نکالے میں علیٹی جاتے اور گھاس کی سخت تبلیاں چُن کر آن کی پن پلی بلتے اور نالے کے ایک حصے سے آبشار کے منہ پر اسے لگادیتے گھاس کی بنی ہوئی پن پلی زور زور سے چکر لیتی ہوئی چلتی تھی اور چروہا اسے دیکھ کر مینتے تھے۔ اور اپنے انجنیئری کے کمال پر خوش ہوتے تھے۔ اسی طرح

کھبیلوں میں سپر گزر جاتی اور جب سورج جنوب مغربی سلسلہ ہاتے کوہ کے پرے  
جانے لگتا۔ تو چوپا یوں کے گلوں میں بختی ہوئی گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ چردائے و پس  
گاؤں میں آ جاتے۔ اور گلاب کی دلکش زندگی ختم ہو جاتی، اب اسے بوڑھے نمبردار کی  
گایوں اور بھینیوں کو دہننا ہوتا، جانوروں کے لئے چارہ اور انماج ڈالنا ہوتا۔ مویشی خان  
میں الاؤتیار کرنا ہوتا۔ دہ الاؤ جس میں آگ کم اور وہوا زیادہ ہوتا تھا۔ یونکہ وہویں  
میں مچھراو مکھیاں جانوروں کو کم تھاتے ہیں۔ رات کو اسے دوستی کی مویشی روٹیاں اور  
آل کا سالن مل جاتا۔ یا گنہمار کی کڑی اور چانوں، یا چانوں اور کرم کا بلہ ہوا ساگ  
ست نرائن گو گاؤں کا نمبردار تھا۔ لیکن اس کے ہاں بھی وہی مچھر پکتا تھا۔ جو گاؤں  
کے غرب سے غریب برہمن کے ہاں۔ اس لئے خوارک کے معاملے میں گلاب بھی گاؤں  
کے دوسرے افراد سے زیادہ پرست نہ تھا۔ فرق صرف آتنا تھا۔ کہ ست زائیں کی  
بیوی اکثر سالن پکاتے پکاتے اور سالن میں نمک ڈالنے سے پہلے گلاب کے لئے  
سالن نکال لیا کرتی تھی، یونکہ گاؤں میں نمک کپڑے سے بھی ہونا گا تھا۔ نمک اور  
گڑ اس لئے گلاب کا سالن اکثر بے نمک ہوتا تھا اور ملکھن کے بغیر روٹیاں اکثر  
آن چپڑی اور باسی ہوتی تھیں۔ اور جب کبھی گھر میں گڑ کے میٹھے چانوں پکتے تھے۔ اور  
ان کی سہانی خوشبو لڑکوں کو بے تاب کر دیتی۔ زاکثر گلاب کا حصہ بھی وہی کھا جاتے  
تھے۔ اور گلاب کی بے تابی غم و غصہ میں تبدیل ہو جاتی، اور وہ منہ پھلانے سے مویشی خان  
میں جا کر سوچانا تھا۔ یونکہ وہ نمبردار کے مویشی خانہ کا چوکیدار تھا۔ مویشی خانہ میں چوپا یوں  
کے جھوٹ کی کٹیٹ بُو، پیٹاپ کا ایونیا، اور الاؤ کا گندہ اور تیر وہو آں اسے پہلے پہل  
برامعلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں جسم پر خارش نکل آئی تھی۔ اور وہ

کتنی مبینے کھانتا رہا تھا۔ لیکن اب وہ ان چند دل کا عادی ہو گیا تھا۔ خارش تواب بھی اسے سردیوں میں نکل آتی تھی۔ لیکن اسے تمثیل اور پُر اب نہ ستابے تھے۔ اس کے جسم کی نسایت دُور ہو رہی تھی، اس کے ہاتھوں کی لمبی اور مخروط انگلیاں جو شاہ کی مصادر یا خورت کی ہوتیں تو بہتر ہوتا، اب جنمائی کسرت سے سخت اور کھروری ہو گئی تھیں۔ اُس کے پاؤں میں بیایاں بھپٹ آتی تھیں، اور سردیوں میں اکثر بیایاں بہت بڑھ جاتیں۔ اور جب ساگرہ کے پہاڑوں پر اور ساگرہ کی دادی میں بہت جنم جاتی تو اسے مویشی خانے سے چوکھز نکالنے اور برفت پر چلنے میں بہت وقت ہوتی۔ کبھی کبھی ان بیایوں میں سے خون رس کر جئنے لگتا اور اس کے پاؤں مُوح کر بخاری ہو جلتے، اور وہ شدید درد سے چپڑا لٹھتا۔ اس نے کتنی دفعہ ست زبان کی بیوی سے کہا تھا۔ کہ وہ اپاؤں کے جو تے بنوادے۔ لیکن ست زبان کی بیوی ہمیشہ اسے یہ کہہ کر ڈال دیتی تھی۔ کہ بیٹا اگلے سال ضرور بنوادوں گی۔ گلاب ست زبان کی بیوی کو ماں کہا کرتا تھا، کو اُسے پڑھتا۔ کہ اس کی حقیقی ماں کون تھی۔ اور کِن حالات میں گاؤں سے نکل بھاگی تھی۔ اور کس طرح اس نے گاؤں والوں کے کہنے کے مقابلے ایک دور کے گاؤں میں خود کشی کر لی تھی، اسے ان سب باتوں کا پتہ تھا۔ اور کتنی دفعہ چروانہ اے اور پرداہیوں نے اسے تنگ کرنے کی خاطر بیاتیں چاکراں کے سامنے دھرائی تھیں۔ اور درگاہ سے وہ اس قدر پیار کرتا تھا۔ اور جس کے لئے وہ اپنی جان تک دینے کو تیار تھا۔ اسے خاص کر بہت چڑھاتی تھی اور یہ باتیں مستاستا دہ اپنا چہرہ اپنی میلی تیص میں چھپا کر دنے لگ جاتا تھا۔ اسے رونا بہت آتا تھا، وہ ذراستی تکلیف پر رد دیتا۔ اور ذراستی بات پڑھنے دیتا اور چروانہوں کو اسے مُلانے میں بہت مزہ آتا تھا۔ لیکن ست زبان کی بیوی تو سچ مج

اسے رُلاتا نہیں چاہتی تھی، وہ آخر ایک عورت تھی اور جنما کے ساتھ لفترت ہوتے ہوئے بھی اسے جنما کے ساتھ ہمدرد می تھی۔ وہ اس کے بیٹے کو چڑھے کے جو تے بنوارتی، لیکن وہ کیا کرے۔ خود اس کے اپنے بیٹا ہمیوں کے پاس چڑھے کے جو تے نہیں ہوتے تھے کبھی ایک کے پھٹھ جلتے اور کبھی دوسرا کے۔ اور اکثر انہیں گھاس کی پولہنپنی پڑتی تھی۔ بلکہ گاؤں کے اکثر افراد تو دھان کے خشک پودوں کو بن کر پولیں تیار کر لیتے تھے اور انہیں کو اپنے پاؤں میں پہنچتے تھے۔ یہ پولیں چڑھے کے جو توں سے بد رجہ تر ہوتیں، مذہبی نقطہ نگاہ سے بھی اور جسمانی آرام کے خیال سے بھی، لیکن نکہ چڑھے کے جو تے تو برفت پر فوراً پھسل جاتے تھے۔ لیکن تھی دھان کے خشک پودوں سے تیار کی ہوئی پولیں کبھی دھوکا نہیں دیتی تھیں۔ یہ بات سچ ہے کہ ان پولوں سے سردی سے بچاؤ نہیں ہو سکتا۔ اور پاؤں اکثر نیلے ہو جاتے تھے اور بیاتیوں سے خون بخشنے لگتا تھا۔ لیکن کیا کیا جائے چھڑہ بہت ہنگامگا تھا۔ اور موچی عوضانہ بہت مانگتے تھے۔ اور یوں بھی تو گائے اور بھینیوں کے جھموں سے بنے ہوئے جو تے بڑھنہوں کے پاؤں کو زیب نہیں دیتے تھے۔ اسی لئے تو گلاب کے لئے چڑھے کے جو تے کبھی نہ بن سکتے تھے۔

وہ تیخ بستہ سردی میں رات کو مولیشی خانہ کا تنگ دروازہ بھی بند کر دیتا۔ اور الائچے دھکتے ہوئے کوئی لوں بیس اپنے سرد پیرڈاں دیتا۔ پیراں قدر مُن ہو چکے ہوتے کہ بہت لمجھے گزر جانے کے بعد ہی ان میں زندگی کی حرارت خود کرتی اور اسے انگاروں کی گرمی کا احساس ہوتا۔ وہ بہت دیر تک اپنے پاؤں الاؤ میں سچنکتا اور جب پاؤں اور جسم خوب گرم ہو جاتے۔ تو اپناؤ ہر اکمل اور ہر کچھ پار پانی پر دراز ہو جاتا۔ اکثر انہوں کو اسے درگاہ کی صورت بہت تنگ کرتی تھی۔ اور مولیشی خانہ کی پصیلی ہوئی کشیت

وھند میں کہ جس میں گندہ بیر و زہ کی سی بوہوتی تھی، وہ اپنے تبریخیل کی مدد سے درگا کا شوخ چہرہ جس کے داہنے گال میں ہفتے وقت ایک دلفریب ذقون پڑتا تھا، ایک واضح صورت میں گھڑ لیتا تھا۔ درگا اسے بہت ستاتی تھی۔ اکٹھا سے گالیاں بھی دیتی تھی اور اس کی ماں کا قصہ دہرا دیا کرتی تھی اور اسے بار بار رلایا کرتی تھی، لیکن اب رودر کر گلاب کارونا بہت کم ہو گیا تھا مشقت کرتے کرتے اس کے جسم کی نمائیت دُور ہو چکی تھی، اصراف اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں کی پلیوں میں کسی سنہری اور اداس خواب کا بلکا سا پر توباقی رہ گیا تھا۔ اور حب گلاب کا دل بہت رنجور ہو جاتا تو وہ اسی اداس خواب کو اپنی غسری کے نفعے میں ڈھال لیتا تھا۔ پھر رات کی تہائیوں میں وہ کبھی موشی فانے کے کواڑکھوں دنیا اور اس کی دہنیز پر بیٹھ کر اپنی سونی ہوئی غسری کو جگاتا۔ اس کے سانس کی لطافت سے غسری حرکت میں آجاتی اور اس کے نفعے زیادہ گردے ہو جاتے، ان کی سسک اور تریپ اور دل کا دکھ بڑھ جاتا۔ مدھم نفعے کے ناچھتے ہوئے تال پر گاڑی کی کنوواریوں کا دل تیزی سے حرکت کرنے لگتا اور بوڑھی عورتوں کو کرشن مردی یاد آ جاتے، ایک دن بوڑھے نمبردار کی بیوی نے جسے وہ ماں کہا کرتا تھا اس سے کہا۔ ”بیٹھا! تم رات کو ایسی نسبی نہ بجا یا کرو!“

”میکیوں ماں؟“

”بیٹھا بیرا دل دکھتا ہے۔ میں کل رات کو مالا چھیر رہی تھی کہ میں نے تمہاری نسبی سُنی۔ اور میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ میں نے سوچا کہ گر کل میں گوپیوں کے درمیان کرشن مردی اسی طرح نسبی بجا تے ہونگے۔ بیٹھا تم یہ نسبی نہ بجا یا کرو! لیکن کئی راتوں کو نسبی کا یہ نغمہ درگا کے دل کو بھی بھیتا ب کر دیتا تھا۔ اور یہ

## لغتے کی موت

جان کر کہ ان لغتوں کا محبوب کون ہے، اس کے دل میں ایک نامعلوم سی خوشی گدگدی لیتی۔ بستر پر لیتے لیتے اس کا سارا جسم ٹوٹنے لگتا۔ اسے اپنے گالوں پر ایک شعلہ سا جلتا ہٹا احسوس ہوتا اور شعلے کی لپک اس کے کانوں تک پہنچ جاتی۔ اور وہ چاہتی کہ کوئی اسے اپنے طاقتوں باز داؤں میں لے لے اور بھنج بھنج کر اسے اپنے لگھے سے لگاتے۔ حتیٰ کہ اس کی سانس بند ہونے لگے لیکن صبح ہوتے ہی اپنے اس احساس پر شرمندگی اور زدامت سی محسوس ہوتی، اور حب وہ جنگل میں گلاب سے ملتی تو اس سے ایسی درشتی اور سخت کلامی سپریش آتی۔ کہ بچارے لڑکے کا زنگ متغیر ہو جاتا اور وہ مرعوب ہو کر چھپے ہٹ جاتا۔ اور چروانے ہے اس کی حالت کو دیکھ کر سنتے اور قہقہہ لگائیں جب گلاب اپنے تھیل میں درگا کو بلا لیتا تھا۔ تو درگا ایک مہربان دیوی کی طرح اس کے پاس آجائی تھی، لمبی، پتلی اور خوبصورت بیخ کی شاخ کی طرح پھر گلاب کو دہی لمحے یاد آتے، جب سچ مچ درگانے اسے پیار کرنے کا موقعہ دیا تھا۔ ایک بار حب درگا نے سردرد کی شکایت کی تھی۔ اور وہ اس کا سراپنی رانوں پر رکھ کر دو گھنٹی دباتا رہا تھا۔ ایک بار حب اس نے بخشہ کے پھولوں کا چھا اس کے بالوں میں ٹانک دیا تھا۔ اور اس کی ٹھوڈی اٹھا کر اور اس کے دونوں خساراً اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کا منہ چوم لیا تھا۔ اور درگا کی محبت آمیز خاموشی نے اس کے دل کو خوشی سے بھر دیا تھا۔ ایک بار اُپنے اُپنے دیواروں کے تنوں کے نیچے اگی ہوئی گرج کی جھاڑیوں کے درمیان حب وہ گرج کے سرخ سرخ چھل کھا رہے تھے۔ درگا نے یہ کاہکاہ کر گرج کے سرخ دانے اس کے منہ میں ڈال دیئے تھے۔ اور گلاب نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اور پھر وہ دیر تک اسی طرح ایک دوسرے کو توڑ توڑ چھل کھلاتے رہے تھے.... لیکن ایسے لمحے گلاب کے لڑکوں

میں بہت کھلتے تھے۔ اور اب ان لمحوں کی شیرینی اور خوبصورتی کی یاد اس کے دل میں  
ٹیک سی پپیا کر دیتی تھی

..... اور پھر گلاب کو موسم غزال کی وہ شام یاد آئی کہ جب نالے میں پانی چڑھا رہتا تھا۔  
اور وہ اور ویگر چڑواہے جنوب مغربی پہاڑوں کے جنگلوں سے اپنے روئوں کو چڑکا دیں  
گاؤں کو لارہتے تھے۔ اس نے درگا کو اپنے گندھوں پر اٹھا لیا تھا اور نالے میں سے گزد  
را تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک سونٹی کے سہارے چل رہا تھا۔ پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا اور  
وہ گاہ سے چھپیرنے کے لئے آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی۔ اور سب سی رہی تھی +

نالے کے درمیان جہاں پانی بہت زور دوں پر تھا، گلاب یہاں کیا کھڑا ہو گیا اور  
کہنے لگا۔ شری پولٹ کی، اب میراجی چاہت تھے کہ تمہیں یہیں پانی میں گردوں کیوں؟ کیسا  
مزار ہے گا۔ درگا نے فرما ایک پیغام کر گانا بند کر دیا۔ اور زور سے اس کے گلے سے پٹ  
گئی۔ اور اپنی ٹانگیں زور سے اس کی چھاتی سے لگا لیں +

گلاب اپنی چالاکی پر بہت خوش ہوا وہ اسی لمبائی کو زیادہ لمبا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن  
کجھ ت پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ اسے پانی کے ٹھنڈا ہونے کا احساس تھا۔ اور اس کے ساتھ  
ہی اپنے گلے میں حماہیل بازوؤں کی نرمی اور گرمی اور اس کی چھاتی پر شکستی ہوتی لالوں  
کے حسین تناسب اور ان نازک ٹھنڈوں کی گولائیوں کا بھی احساس تھا۔

لیکن پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ وہ آگے چلنے پر محبوبر ہو گیا۔ اور درگا نے پھر گانا  
شروع کر دیا۔

راستے میں گلاب پھر ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ اور پولا۔

”ایک بات کہو۔ اگر تم بھی سچ سچ کہو؟“

سکو، میں بھی سچ سچ کہوں گی:

”تمہیں شو جی کی قسم!“

”ہاں مجھے شو جی مہاراج کی قسم!“

”د کیا میں تمہیں اچھا لگتا ہوں؟“

کچھ عرصہ گلاب خاموشی سے پانی میں کھڑا رہا۔ پھر دُرگا بولی۔ نہایت سنجیدہ لمحے میں اب تم نے جو من کی بات پوچھی ہے، تو میں بھی سچ سچ کہوں گی۔ تم مجھے اچھے تو لگتے ہو لیکن اتنے اچھے نہیں کہ میں تمہارے ساتھ بجاگ جاؤں۔ اور پھر شادی تو ماں باپ کے بیٹے میں ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ تمہاری میری شادی کبھی نہیں ہو سکتی۔ ایک تو تمہاری ماں کا قصیہ ہے۔ اور پھر... بُرانہ ماننا... تھمارے پاس نہ ہیں ہے، نہ نہ یور، نہ مکان۔ ...

کچھ بھی تو نہیں... بُرانہ ماننا گلاب... تم نے من کی بات پوچھی تھی +  
گلاب یا کایک آسمان سے نہیں پڑا تر آیا۔ اسے ایک دھچکا سا محسوس ہوا۔ وہ کوئی بات نہ کہہ سکا۔ اور سچ مجھ درج کا کی باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پانی میں چلنے پھلتے اسے محسوس ہوا۔ کہ اس کی ٹانگیں بے جان ہو گئی ہیں۔ اور وہ خود بھی ایک بے جان لوٹھ کو کندھوں پر آٹھاتے ہوئے گزر رہا ہے +

پھر کنارہ آگیا۔ اور دُرگا فوراً ہی اس کے کندھوں سے اُڑتی ہی۔ اور وہ ایک دسرے سے انکھیں نہ ملا سکے +

رات کو مولیشی خانہ کی دہلیز پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی بُسری کو کتی یا جھپٹا لیکن وہ ہے لبؤں تک نسلے جا سکا۔ اور اسے احساس ہوا کہ اب اس بُسری میں کوئی نغمہ ہی باقی نہیں ہے



# باؤں پتے

حسن عباس بیٹے



بند کرے میں ایک دھلی ہوئی چادر پر سُرخ رنگ کے تاش تپے بکھر رہے تھے۔  
 یہ ایک پڑافی وضع کا کمرہ تھا۔ کرنے میں رکھی ہوئی میز کی چھاتی پر دو ایک ضغیں  
 کتابیں پڑی تھیں، جن کے لکھنے اور اق پر آتش نفس انسانوں کے انکار سلگ رہے  
 تھے۔ کمرے کی وزنی چھٹت کو ایک بوڑھا شستہ نیراپنے سینہ کے زور سے سنبھالے ہوتے  
 تھا۔ اپنی اس مظلوم حالت میں، احتیاج کے طور پر وہ کبھی کبھی کڑکڑ کی صد اپنڈ کر  
 دیتا۔ درمیان سے اس کی کربجی جھک گئی تھی، اور اس خلامیں ایک بوڑھے چڑے  
 چڑھانے گھومند لانبار کھا تھا۔ کہیں دیوار کے ایک ردشہدان سے وہ روزا نہ دانہ دُن کا  
 پچلنے کے لئے اڑ جاتے۔ ان نتھے مُنتے پردار ذمی روحوں کو جنگل کے بڑی پھونج والے  
 پرندے دل نے خوفزدہ کر کھا تھا۔ ان کی ہم لو اچڑیاں کو بھی انہوں نے پر زیچ کر گنجائی  
 انہیں سرچھپانے کر جگہ نہ تھی۔ اپنی چڑچوں میں محو یہ بوڑھا جوڑا اس ٹیڑھے گھونسے  
 میں موت کے لئے چھپلا وابن کر زندگی کی شام اس کمرے کی بند فضای میں بس کر رہا تھا۔  
 عموماً دوسرے جب ایک دبلا پبلہ لڑکا بالائی منزل سے دوستوں کے ساتھ تاش  
 کیپلانے کے لئے کمرے میں آتا تو یہ دونوں اُن کے کھیل کو گرمی نظر وں سے دیکھتے۔  
 شاید انہیں ان سُرخ دسیاہ اشکال سے کچھ دیکھ پی ہو گتی تھی۔  
 چادر پر بکھرے ہوتے پتوں نے آج خود بخوبی حرکت کرنا شروع کر دی۔

چڑے چڑیا نے بھی یہ کھیل نہ دیکھا تھا۔ اپنے گھونسے سے گردنبیں لٹکاتے اُنہوں نے خور سے اس طسم کو دیکھنا شروع کیا۔

ایک مختصر سی حرکت کے بعد یہ پتے کچھ اور پھر گئے۔ یہ کا یہ اینٹ کا باڈشاہ باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے لخوت پسندی سے اینٹ کے غلام کو آواز دی کہ تو جواب نہ پا کر وہ بڑا یا اور اپنے ہم ٹینسول کے قریب تر ہو کر ایک بار پھر آواز دی، لیکن اس کی پُکار کا کوئی جواب نہ تھا۔ غصہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس نے تپوں میں سے اس غلام کو جبراً لکھنچ کر باہر نکال دیا۔

اوندھے منہ پڑے ہوئے تھے یہ کا یہ ہوشیار ہو گئے۔ حکم، پان اور چڑیا کا باڈشاہ بھی اسکے پہنچے ہم مرتبہ کی صفت میں کھڑے ہو گئے۔

”تم آواز کا جواب کیوں نہیں دیتے۔۔۔ بھرے ہو گئے ہو گیا؟“

دفعہ غلام کی آنکھیں اپنے غضب ناک آقا کی طرف اٹھیں۔ وہ ارادت آذرا پسچھے بہٹ گیا۔ اینٹ کے باڈشاہ نے بڑھ کر اس کے ایک زبردست چپت رسید کیا۔ آقا عموٰ مآپے سے باہر ہو جایا کرتے ہیں۔

غلام نے اپنا ہاتھ سرخ گال پر رکھ لیا۔ خوناب آنکھوں سے اس نے دوبارہ آقا کے ڈراؤ نے چہرے کی طرف دیکھا۔ سر پھر آقا یہ بھی برداشت نہ کر سکا اور اس نے غلام کو بُری طرح سے زچنا شروع کیا۔ جملہ بیگیات اس منظر کو دیکھ کر پھر اگئیں ہیکے پتے بھی ایک دوسرے سے اشاروں میں بائیں کرنے لگے۔ پان، حکم اور چڑیا کے غلام بھی آنکھیں کھوئے گئے سافس لے رہے تھے۔۔۔ سرداہیں ملکیت سے خالق غلاموں کے جذبہ احتجاج کی گرمی کو اندر رہی اندر ٹھنڈا کر دیتی ہیں۔

یکا یک پان کے غلام نے ٹرہ کر بادشاہ کے ظالم ہاتھ کو روک لیا۔

”ٹھیریے اب آپ کو ظلم و قشید سے ہاتھ کھینچتا ہو گا؟“

پان کا غلام غصہ سے کانپ رہا تھا۔ بادشاہ نے اُسے زور سے ایک جھٹکا دیا۔ اور وہ بے تحاشا گر پڑا۔ زمین سے ٹکراتے ہی اس کے سر سے خون کی دھماکہ اپنے گی۔

”اپنی آپ کیا کر رہے ہیں؟“ — ایشت کی بیگم بے خود ہو کر اگے بڑھنے لگی۔ لیکن بادشاہ کی خزینہ نگاہوں نے اس کی جرأت کو پسپا کر دیا۔

حکم کے بادشاہ نے جو اپنے ساتھیوں سمیت تماشا دیکھنے میں مصروف تھا، حکم کے یکہ کو اشارہ سے بُلا کر پان کے غلام کی گرفتاری کے لئے حکم دیا۔

”لے جاؤ اس غلام کو جیل خانہ میں۔ کمینہ کیسیں کا، آقا کے سامنے ہاتھ اٹھاتا ہے۔“ — حکم کا بادشاہ ملوکیت کا خدا نظر آتا تھا۔

تماش کے ہلکے پتے جذبات کے انتہائی ہشتعل سے کاپنے لگے۔ ایسا معلوم ہوا تھا۔ کہ ان میں بغاوت کی روح سما رہی ہے۔

”وہم آپ کے غلام سہی لیکن ہم اپنا جسم و جان آپ کے حوالے نہیں کر سکتے مجھے قید کیوں کرتے ہو۔ میں کھلی فضائیں جیسا چاہتا ہوں۔“

مجموعی طاقت کے خوف سے ڈر دیا۔ تمہارا قشید وہماری ضمیر کو مُردہ نہیں کر سکتا۔ پان کا غلام گرفتاری کے وقت چڑا چڑا کر آقا دل کو قاتل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اس دلیری پر جنم کے یکہ نے اس کے چاندیار سید کیا —

مشتعل پتے بیدھڑک ہو چکے تھے۔ حکم کا غلام اپنے ساتھی کی یہ بے قدر می خود یکھ سکا۔ اس نے ڈر دیا کریکہ کو اپنے سیاہ بازوں کی گرفت میں لے کر پان کے غلام کو

آزاد کرنے کے لئے جھٹکا دیا۔ چڑیا کا غلام بھی سامنے تھا گیا۔

— اب شاہروں کے پاس بائیوں نے غصہ میں آ کر ہنڑ پر سانانش رو رع کر دیتے۔ وہ قشیدہ سے غلاموں کو زیر کرنا چاہتے تھے ملکے پتوں کا شتعمل مجمع تند بھیریوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔ مجموعی طاقت کے سیلاں کے آگے ایکے اور باوشاہ جو اس کے سنبھالی میں اب بیگیات کو سنبھال رہے تھے خس دغاشاک کی طرح بھر گئے۔ ملوکیت، جس کے عجب نے ان کی زندگی کو پاؤں تھے دبار کھا تھا۔ آج ان کے کندھوں پر جنازہ بن کر مرتوں کی کڑوی نیند سورہی لختی۔ — غلاموں کی آزادی اس کے تابوت کا آخری کیل تھی۔

غلاموں اور آقاوں کی اس مذہبیہ میں پان کی تگی اور حکم کے چوتے پنجے کے بھی معمول چڑیں آتیں۔

— آزاد پتوں نے اب اپنی ترتیب کو بالکل بدلتا تاکہ آئندہ کوئی پتہ کسی دستے کھلاڑی کے ہاتھ میں کھٹپٹی بن کر ایک دوسرے پر دار د کر سکے۔ — یہ کھیل دیکھ کر بہوت چڑے نے چڑیا کے کان میں کچھ چڑچوں کی۔ دونوں چنگل کی گھنی فضا کی طرف پرداز کر گئے ہے۔



پرورد

اوپندر ناظر اش

کسی قسم کے احساس کے بغیر بگوبند نے چُپ چاپ لکشمی کی چار پاتی کے ارد گرد پر دے لگا دیتے پر دے جو لکھری کے فریم میں سفید کپڑا لگا کر بناتے گئے تھے۔ اور حسب خواہش کھو لے یا بند کئے جاسکتے تھے۔ تب مسلطانہ اور بیوی تیز تیز چلتی ہوئی آئیں۔ اور ان کے بعد متین اور سجنیدہ داکٹر صاحب اپنے بھاری قدم آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے پر دوں کے اندر چلے گئے۔

پچھے لمحة تک لکرے یہی خاموشی چھپاتی رہی۔ صرف چھت پر لگے ہوئے سیند پر دوں والے پنکھے اپنی پوری رفتار سے لکھر لکھرتے رہے۔ اور جون کی تینی دو پر اپنی نیم دا انکھوں سے غنوڈگی کی سی حالت یہی چُپ چاپ پڑی رہی۔

یکایک پر دے کے پیچھے سے پچھہ اکھڑی اکھڑی سانسوں کی آداز آئی۔ پھر لکشمی کے بیکے بیکے الفاظ اور پھر سلطانہ کی لمبی سانس ڈاکٹر نے کہا۔ شریخ پرے آفرا اور یہ کہ کر پر دے کے پیچھے سے نکل، وہ جیسے آتے رہنے ادیسے ہی پلے گئے۔ ان کے پیچھے رہ والتے انکھیں پوچھتی ہوئی سلطانہ نہ تخلی۔ دوسری طرف بیمار عوتین جس سبھری نظر دوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس کے نکلتے ہی رشیدہ نے پوچھا۔  
— ”کیوں؟“

”ختم ہو گئی!“ — پھرے لگے سے سلطانہ نے جواب دیا۔

آخری وقت کیا کہتی تھیں؟ ” — سُر قی بولی۔

وہ صرف ایک بار کھنہ صاحب کو یاد کیا اور میں ! اور یہ کہہ کر آنسو پر چھپتی ہوئی سلطان جلد جلد مشیر بھر لینے کے لئے چلی گئی۔

لکشمی اپنے خادند کو کھنہ صاحب، کہہ کر پکار کرتی تھی وہ لاہورہ ہی میں ملازم تھے۔ اور ہر ساتویں دن باقاعدہ اسے دیکھنے آتے تھے۔ کوئی ایسے خوش شکل تو نہ تھے مگر ایسے بھی نہیں کہ بد صورت رکھے جا سکیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی بات تھی۔ کہ آدمی بے ساختہ ان کی ہلف کھج جاتا تھا اور پھر اتنی باتیں کرتے تھے، اتنے قہقہے لگاتے تھے کہ جب وہ آ جاتے تو ہسپتال کی اس خاموش اور ساکن فضائیں نہ گئیں وہ طلاقی فقط لکشمی ہی ان کے آنے کا انتظار کرتی ہوئی بات نہیں۔ اس کھلے اور کشادہ کرے میں لوہے کی سخت، بے درد چار پانیوں پر لیٹی ہوئی بخار، حرارت، دوا، پرہیز کی باتیں من من کر عاجز آئی ہوئی دوسرا بیمار عورت میں بھی ان کے آنے کی راہ دیکھا کرتی تھیں وہ باتیں چاہے اپنے رشته داروں سے کرتی ہوں، لیکن کان ان کے ادھر ہی لگے رہتے تھے اور لکشمی وہ تو نہ جانے یہ سات دن کیسے کامستی تھی؟ ہفتی تھی، دوسروں کو ہنساتی تھی، لیکن اس تمام سنبھلی تھی میں اپنے خادند کا انتظار جیسے اس کے دل کے کسی نامعلوم گوشے میں جھپٹا رہتا تھا اور کون جانتا ہے کہ یہ سنبھلی قہقہے ہسپتال میں ایک بار طلوع ہو کر پھر غروب ہی نہ ہونے والے، دنوں کو کاشنے کا مخصوص بہانہ نہ تھے۔ یہ بات بھی نہیں اُسے اپنے خادند سے اتنی محبت اس مددگر بیماری کے دنوں میں ہوتی، اُسی دن جب شادی کے بعد ایک ہمینہ گزار کروہ اپنے میکے واپس آتی تھی۔

تو اس کی سہیلیوں نے جان لیا تھا۔ کہ بستی کی آزاد فضا میں رات دن کھیلنے والی، مگری مخلوں کو اپنے قہقتوں سے گونجنا دینے والی لکشمنی اب محبت کی زنجیروں میں جکڑی گئی ہے۔ جب سہیلیاں اُسے چاروں طرف سے گھیر کر بیٹھ گئی تھیں تو اُس نے فخر سے کہا تھا: "ان کی بات پوچھتی ہو، وہ تو مجھے پل بھر کے لئے بھی اپنی آنکھوں سے اوچھل نہیں ہونے دیتے کتنی کتنی دیر میری طرف دیکھتے رہتے ہیں اور کتنے ہیں ....."

فرط حیات سے اُس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا تھا اور پھر سہیلیوں کے اصرار پر اس نے گلاب بن بن کر کہا تھا۔ کتنے ہیں پتم تو سورگ کی دیوی ہو، میں تمہاری پُریما کرنا ہوں ॥

ستشا کی رشک بھری نظر دی نے تب دیکھا تھا کہ اس کی یہ بات اپنے خاوند سے ہر منہ دعورت کو جو محبت ہوتی ہے، اس کی ہی مظہر نہیں، بلکہ اس حقیقت پر مبنی تھی جس کی تائید اس کارروائی رہا تھا۔ تب اپنے خاوند کی بےاتفاقی کا دھیان آجائے پر ایک سرد آہ اُس کے دل کی گمراہیوں سے نکل گئی۔

ساڈرہی نے اپنے حسد کا اظہار ایک دوسرے ہی طریق پر کیا۔ کھسیانی سی ہنسی ہشتے ہوتے ہوئے بولی — "ماں بہن، انہیں محبت کیوں نہ ہوگی۔ ایک بار ہاتھ سے گنو کر ہی آدمی کسی چیز کی قدر کرنا سیکھتا ہے ॥

اس فقرے میں جو طنز پہنچاں تھا اُس کی طرف دھیان دیتے بغیر سادہ لوح لکشمنی نے صستی کی رو میں سہیلیوں کو اپنی اس ایک میانے کی ازدواجی زندگی کی بیسوں کہانیاں سنتا ڈالیں تھیں۔ کس طرح اس کے شوہر اس پر جان چھڑ کتے ہیں۔ اسے آنکھوں سے اوچھل کرنا پسند نہیں کرتے۔ و فقرے میں نہ جانے کیسے وقت گزارتے ہیں؟ "پہلی بیوی"

— وہ کہتے ہیں ۔ تو وہ تو گزار اور ہیو قوف بخی۔ تمہیں پاکر تو ہمیں نے زندگی کی منزیں پالی ہیں۔

تازیا نے قبضہ سختے ہوئے کہا۔ — «ساس کو یہ سب کچھ کیسے بھانا ہو گا؟»

«اُن کے دل کی میں کیا جاؤں؟» لکشمی نے مسترد بھرے لیجے میں جواب دیا۔  
لیکن بیٹھی تو وہ ایسی ہیں جیسے مصری۔ بولتی ہیں تو رس گھول دیتی ہیں۔ میری تو  
عادت تھم جانتی ہو سوتے سوتے دن نکل آتا ہے۔ مگر انہوں نے اس کا کبھی بڑا نہیں ملتا۔  
وہ خود چاربجے علی الصباح اٹھ کر، نہادھو، پوچا پاٹھ کر، لھر کا سب کام ختم کر دیتی ہیں۔  
میں کچھ کرنے کی کوشش بھی کر دیں تو کہتی ہیں ۔ تمہیں ہی تو کہنا ہے ہو۔ میں کب  
تاک بیٹھی رہوں گی؟

اور اس دن بستی میں لکشمی کی رحم دل اور فرض شناس ساس اور محبت کرنے  
والے، ہنس ملکھ خاوند کی کہانی لھر چکیل گئی بخی اور شادی شد و لڑکیوں نے دعا کی۔ کہ  
اُن کے خاوند اور ساسیں بھی ایسی ہیں جاتیں اور گزاری لڑکیوں نے دل ہی دل  
میں کھا۔ «بھگوان ہمیں بھی ایسا ہی لھر دینا۔»

ربڑ کے پیسوں والا سڑک پر چپ چپ مشرقی دروازے سے داخل ہوا۔ گوبند  
اسے دھکیل رہا تھا اور اس سلطانہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلی آ رہی تھیں۔ اس کا  
بھیشہ ہنسنے والا چہرہ اُتر اہوا تھا۔ جیسے اسی کے کسی قریبی رشتہ دار کی موت ہو گئی  
ہو۔ متین سہپتال میں بھیشہ ہوتا کرتی ہیں۔ اور سہپتال کے ملازم اس درجہ ان کے  
خواجہ ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے سب کام کسی قسم کے احسان کے بغیر کتے جاتے ہیں۔ لیکن  
لکشمی سے سلطانہ کو محبت می ہو گئی بخی۔ سلطانہ پر ہی کیا موقوف سب کو اس سے

اُنس ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی ازدواجی زندگی کے لئے ہی واقعات ایک عجیب سادگی سے بیان کئے تھے۔ اپنی ساس کے متعلق اس کے دل میں جو بلند خیالات تھے نہیں ہوا ہوتے دیر نہیں لگی۔ دہی زبان جو پسلے رس کی دھاریں بھاتی تھی بعد کو زہر بھی لگتے لگی۔ کھنہ صاحب تب ملازم نہیں ہوتے تھے۔ مگر کھر کی سیاست بین و ماہر تھے۔ اپنا کام چالاکی سے نکالنا جانتے تھے۔ ماں کے سامنے چُپ رہتے ہیں لیکن تنہائی میں کہتے ہیں لکشمی ان سب قصوروں کے لئے یہی تم سے معافی چاہتا ہوا۔ اور تب اُسے ساس کی جھڑکیاں، طعنے کو سنے، گالیاں بالکل بھول جاتیں اور خداوند سے اُس کی عقیدت کتی گئی بڑھ جاتی۔ وہ ساتھ ہیں تو پھر چاہے سارا جہاں خلاف ہو جاتے، وہ سب کی مخالفت خوشی خوشی جھیل لے گی۔ جی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو خوش کرنے کے لئے اس نے بھگوتی درکاکی پوچھا سیکھی اور اپنی سہل انگاری کو چھوڑ کر محنت سے کام کرنے کی عادت بھی ڈالی۔ لیکن ان سب بازوں کے باوجود اس کے تیور نہ بدے۔ اس کی جھڑکیاں، طعنے، کو سنے پر تردد جاری رہے۔ مگر لکشمی نے سب کچھ سنبھالنے کے لیا تھا۔ اب ایک بار جب جلتا ہوا لھی گر جانے سے اس کے ہاتھ جل گئے تھے اور ابھی آرام بھی نہ آنے پا یا تھا کہ اس کی ساس نے پھر وہ کھری کھڑی اس کے سامنے رکھ دی تھی، تو اس کی ہمیشہ مسکرانے والی آنکھیں بھرا تھیں۔ پھرے دھوتے دھوتے اس کے چھالے پھوٹ گئے۔ تب اندر کرے ہیں جا کر وہ خوب جی بھر کر روئی تھی اور جب کھنہ صاحب آئے تھے تو اس نے کہا تھا مجھے اس فرک سے چھٹکا را دلاو۔ ماں اگر دھن والی ہے تو کیا اسی لئے پر فرک کی اوتیں برداشت کئے جاتیں۔ تمہارے ساتھ تو مجھے سوکھی روئی پسند ہے۔ مگر غلبہ

تو اب نہیں سہا جاتا۔<sup>۱۱</sup>

کھنڈہ صاحب نے اُسے قتلی دمی ختنی اور تقبیل کے تصورات کا مختندا بچھا ہا۔ اس کے جلوتے ہوئے زخمیوں پر رکھ دیا تھا۔ انہوں نے کیا کیا کچھ نہ کہا تھا۔ جب وہ ملازم ہو جائیں گے تو اُسے اپنے ساتھ لا ہو رے جاتیں گے۔ ماں تو نواں شہر ہی میں رہے گی اور دہاں لا ہو رہیں ۔۔۔ انارکلی، مال، لارنس، بانغ، سینما، تماشے، نمائشیں اور ان ہی میں ستر تجھش تصورات میں کم ہو کر وہ اپنے چھالوں کی میں اپنے دل کا درد سب کچھ بھول گئی تھی۔ لیکن سنگ دل قسمت! جب وہ دن آیا اور کھنڈہ صاحب لا ہو رہی میں سیکر ٹرہ بیٹ میں ملازم ہو گئے تو وہ دق جیسی ہدایت بیماری میں مبتلا ہو گئی۔

آہستہ آہستہ چلتا ہوا ستر بچر مردے کے چیچھے پہنچا اور کچھ لمبے بعد سفید چادر میں لپٹا ہوا مہریوں کا ایک ڈھانچہ لے کر دونوں طرف کچھی ہموڑی چار پا تیوں میں سے ہوتا ہوا مغربی دروازے سے باہر نکل گیا۔ ڈاکٹر صاحب برآمد ہے ہی میں کھڑے تھے۔ وہیں سے انہوں نے کہا: "مردہ خالنے میں لے جاؤ۔ تب تک کھنڈہ صاحب آجائیں گے۔ لہنا سن گھوڑ کب کا گیا ہوا ہے؟"

پل بھر کے لئے بیمار عورتوں کے دل و ہدایات کرنے لگے لکشمی کا نجیف و نازوال دق سے مر جھیا یا ہوا، موت کی اس سفید چادر میں لپٹا ہوا مدقوق جسم سب کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ دق کی ان سب مرلیخیوں کا بھی تو آخر یہی حشر ہو گا۔ موت سے بھی زیادہ اندر دہنائک ہے۔ اپنے ہی جیسی بیماری سے کسی کو مرتے دیکھنا اور خود تل تل کر کے مزما بہتوں کی آنکھوں کی سامنے انہیں اسراچھا گیا۔ اور بعض کے انسو

بہنے لگے۔

پردوے کے چیخچے سے نکل کر مس بیٹی غسل فانے میں ہاتھ صاف کرنے پہنچی تو ہمیشہ دوسروں کا دکھ درد بٹانے والی رحم دل سلطانہ نے اس غناک ماحل کو کچھ بدلتے کی کوشش کی۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا ہمیشہ، جب کوئی مریضہ اس بھیانک بیماری کے ماتھوں نجات پاتی تھی اور مکرے میں موت کی اُد اس خاموشی چھا جاتی تھی تو مس سلطانہ اپنے میسمے، تسلی آمیز اجہہ میں اپنی دلچسپ ہاؤں، اپنے حیرت انگیز قصتوں سے اس موت کی خاموشی کو دور کرنے کی کوشش لیا کرتی تھی۔ بر سر ڈیڑھ برس سے لکشمی بھی اس کام میں اس کا ماتھ بٹا تی آئی تھی۔ لیکن آج وہ خود ہی موت کی گھری خاموشی میں سما گئی تھی ۔

گھری نے ٹن ٹن دو بجا تے۔ ٹپر پھر لینے کا وقت ہو گیا تھا۔ دل میں اُدھتے ہوئے آنسوؤں کے طوفان کو زبردستی روک کر، ددا میں پڑے ہوئے تھرما میر کو ماتھ میں لئے اور مسکرا نے کی کوشش کرتے ہوئے وہ رشیدہ کی چار پاتی کے پاس پہنچی۔ لیکن آج سعی بیمار کے باوجود وہ لکشمی کی موت کو ہنسی کے پردے میں نہ چھپا سکی ۔

رشیدہ نے کہا: "مس صاحب لکشمی بھی چلی گئی۔"

تھرما میر کو رشیدہ کی زبان کے نیچے دکھ کر سلطانہ نے ایک لمبی سانس لی۔ اُدھیں کی رفتار دیکھنے کے لئے اس کی کھلا تی ہاتھ میں تھام لی۔

سرقی نے کہا: "آخری وقت تک اپنے خاوند کا نام اُس کی زبان پر مہا کیوں مس صاحب! کھنہ صاحب بھی اس سے اتنا ہی پیار کرتے ہوں گے؟"

ہوں گے کیا۔ کرتے ہیں۔ سلطانہ نے رشیدہ کی کلائقی کو چھوڑ کر کہا یہ لکشمی کو منا بھی اسی لئے سهل ہو گیا۔ میں تو سچھتی ہوں، الحمد للہ کرنے والے خادوند جس خوش قسمت کے پاس ہے۔ بروت اسے کچھ بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتی۔ بے ہوش ہونے سے کچھ دیرہ پہلے جب اسے معلوم ہو گیا۔ کہ اس کا آخری وقت بس اب زدیک ہے تو مجھ سے اس نے کہا تھا۔ «مس صاحب جانے وہ کیوں نہیں آتے۔ کاش وہ میرے پاس ہوئے۔ پھر خود ہی ہنس کر بولی۔ مس صاحب میں بھی کتنی بیوقوف ہوں، وہ نہ بھی میں تو وہ مجھ سے دُور نہیں کیا؟ میرے دل میں تو ہر وقت انہیں کی تصور رہتی ہے۔ اور میں ہی آن سے کیا دُور ہوں؟ کتنی بار انہوں نے کہا ہے۔ لکشمی! تم ہر وقت میرے پاس رہتی ہو۔ بارہ ماں کام کرتے کرتے تمہارا خیال آ جانے سے غلطی ہو جاتی ہے۔» اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ مرتبے دم بھی جب اسے ہوش آیا تو خادوند کا نام ہی اس کی زبان پر پڑتا۔

یہ کہتے ہوئے بھیگی آنکھوں کو پوچھو، لکھڑی دیکھ کر سلطانہ نے لکھڑا میر کو رشیدہ کے منہ سے نکال لیا اور عمارت نوٹ کرنے کے لئے چارت اٹھایا۔

سرتی نے پوچھا یہ لیکن مس صاحب یہ گھنوں کی بات کیا تھی۔ جب بھی کھنہ صاحب آتے تھے۔ ان کا ذکر ضرور پڑھاتا تھا۔ جب سے گئنے لے گئے ہیں ایک بار ہی پھر آئے۔ لکھڑا میر کو دو ایں ڈال کر اور دوسرا اٹھا کر سرتی کو دیتے ہوئے اس نے کہا۔ میں نے پوچھا نہیں، لیکن جب لکشمی آئی تھی تو سب گئنے ساتھ لائی تھی۔ اس کی میں چاہتی تھی کہ وہ ایک بھی گھنا ساختے جاتے۔ آخر ہی پتنا میں اتنے گھنوں کا کام بھی کیا ہے؟ باز و بند، چوڑیاں، مالا، لاکٹ کوئی ایک گھنا ہو تو گناوں۔ نہ جانتے کیوں

بی مرد

اُسے گھنٹوں سے اتنی محبت تھی۔ ساس تو مرتبہ دم تک نہ چانے دیتی۔ لیکن لفڑہ صاحب اپنی ماں کو سمجھا بجھا کرے آتے تھے یہاں مراضیوں کو گئنے پہنچنے کی اجازت نہیں دی کرہ صاحب نے سمجھایا کہ انہیں سانحہ نہیں لانا چاہیتے تھا۔ اب بھی بہتر ہے کہ انہیں لفڑہ صاحب کے حوالے کر دو۔ لیکن وہ گئنے اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی تھی۔ آخر ڈاکٹر صاحب نے گئنے ایک روہے کے صندوق پنج میں بند کر کے چابی اُسے دے دی۔ اور صندوق پنج کو ہسپتال کے سینت میں رکھ دیا۔ اس چابی کو وہ لختہ بھر کے لئے بھی جدا نہ کرتی تھی لیکن جب بیماری بڑھ گئی اور تن بدن کا بھی ہوش اُسے نہ رہا۔ اور جب ایک دن لفڑہ صاحب کے گئنے پر میں نے اُسے سمجھایا کہ گئنے تمہارے ہی نام بُنک میں جمع کرتے جا سکتے ہیں تو اُس نے چابی دے دی۔ یہی ایک بات بالکل شرمی میں مجھے عجیب نظر آئی۔ لیکن شاید انہی کے ذریعے وہ اپنے اُپ کو زندہ سمجھتی تھی۔ اُسی رات اس نے مجھے پاس بلاؤ کہا تھا۔ — «مس صاحب اب میں بست دیر تک نہ نہیں رہوں گی۔»

مرتی کی زبان ہتر ما میر کی وجہ سے دُکھنے لگی تھی۔ آخر اُس نے خود ہی نکال کر مس سلطانہ کو دے دیا۔ چونکہ کر سلطانہ نے ہتر ما میر لے لیا اور تپڑہ بخرد لیکھنے لگی۔ مرتی نے کہا: یہ تو ٹھیک ہے مس صاحب، لیکن گئنے پہنچنے کے بعد لفڑہ صاحب نے ہر سفہتہ آنا کیوں چھوڑ دیا؟ دو سفہتے گزر گئے انہیں آتے ہوتے۔

رشیدہ بولی۔ یہاں نہ ہو گئے ہوں۔ نہیں تو گرمی سردی، بارش، وہوپ انہوں نے کسی بات کا کبھی خیال نہیں کیا۔ باقاعدہ ہر سفہتے آتے رہے اور میں تو سوچتی ہوں مس صاحب بالکل شرمی کی موت کی خبر سن کر ان کے دل پر کسی گزرے گی؟ اپنی بیوی سے

کسی کو ہی ایسی محبت ہوگی۔

تب شاید ستر چھر مردہ خانے میں پہنچا کر گوبند داپس آیا۔ اور اس کے شیخچے ڈاکٹر صاحب بھی آتے پر دے کے پاس پنج کر گوبند نے پوچھا یہ پڑوں کو پیش دوں صاحب ڈاکٹر صاحب اُس کے پاس جا کر لھڑے ہو گئے۔ بوئے ہسپتال کی چادری کو ڈس انفلکٹریں ڈال دو اور باقی کاسامان پُر اہنسے دو۔ ابھی شاید کھنہ صاحب یا اُن کا ادمی آ جاتے۔ مانگتے باہر دھوپ میں ڈال دو۔

اسی لمحے برآمدے کے پاس سیرھیوں پر سے سائیکل چینک کر ہانپتا ہزاپینے سے تر لہنا سن گکہ اندر آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

کیوں! کھنہ صاحب ملے۔ بیمار تو نہیں؟“

لہنا سن گکہ نے سر ہلا کا۔ اُس کی سانس پھول رہی تھی۔ جواب نہ بن پڑتا تھا۔

ذرائعی سے ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ “ملے یا نہیں؟ کہا نہیں تھے کہ لاش کو آج شام سے پہلے جایا۔“

ٹھوک کر لہنا سن گکہ نے کہا۔ ”دوہ تو شادی کرنے اپنے لھر پھے گئے تھے میں۔“

مُن سے ٹپری چر کا چارٹ مس سلطانہ کے ہاتھ سے فرش پر گزپڑا اور رشیدہ نے جیسے کھرا کر چینتے ہوئے کہا۔ ”مس صاحب! مس صاحب!“



# پینگکے چار بیکار

سدنش

کچھ زمانہ گزرا۔ شماں ہن دوستان میں دو پہاڑیوں کے درمیان ایک گزار  
قطعہ آپادھنا جس کا نام چین مگر تھا۔ اس کی آبادی پانچ چھوٹے نہروں پر مشتمل تھی۔  
یہاں کے لوگ بالکل سادہ لوح تھے۔ ہر ایک آدمی اپنا اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے  
کرتا تھا اور کسی کو کسی سے شکایت نہ تھی ۔

وہاں کے لوگ دن بھر محنت مشقت کرتے تھے۔ اس لئے وہاں بھایاں نہ  
تھیں۔ دو ایسیں نہ تھیں۔ شفا خانے نہ تھے۔ وہاں کے لوگ باہمی محبت و پیار سے  
رہتے تھے۔ اس لئے وہاں عدالتیں نہ تھیں۔ دکیل نہ تھے۔ جیل خانے نہ تھے۔  
وہاں کے لوگ اپنی کمائی پر صابر و شاکر تھے۔ اس لئے وہاں چوریاں نہ ہوتی تھیں  
نہ وہاں پولیس تھی۔ نہ تلواریں۔ بندوقیں اور توپیں تھیں۔ وہاں کے لوگ پرہیزگار  
تھے۔ اس لئے وہاں نہ فاحشہ عورتیں تھیں نہ شراب پس لھتی۔ نہ قتل و خون کے مقدے  
تھے۔ وہاں کے لوگ انتہادر چہرے کے مہماں نواز تھے۔ اس لئے وہاں نہ سرائیں  
تھیں نہ دھرم سالے تھے۔ نہ ہوٹل تھے۔ عزضیلہ وہاں کے لوگ ریدھے سادے  
تھے۔ اور محنت مشقت کے موٹے قانون کے سوائے دوسرا کوئی قانون راجح  
نہ تھا۔ وہ قانون یہ تھا کہ جو محنت کرے۔ لکھاتے۔ جو بیکار رہے بھوکا رہے۔ سب  
کام کرتے تھے۔ صرف چار آدمی تھے۔ جن کو کام کرنے سے عار تھا۔ وہ بھوکے

مرتے تھے اور لوگوں کی خیرات پر بے شرموں کی زندگی بس رکھتے تھے آخراً یہ  
دن لوگوں نے انہیں گاؤں سے باہر نکال دیا۔ اب دن سب کام کرنے والے  
تھے۔ بیکار کوئی بھی نہ تھا ہے

لیکن شیطان کو غیر مہذب؟ بیو قوفوں کی یہ چھوٹی سی دنیا پسند نہ آئی اور  
اس نے عزم کر لیا۔ کہ میں اسے مہذب بنادوں گا اور یہاں کے رہنے والوں پر  
اقبال اور ترقی کے دروازے کھول دوں گا۔

(۴)

दوس्रے دن شیطان کے حکم سے ایک خوبصورت اور متہول سوداگر چین گزر  
میں داخل ہوا اور تھارے گاؤں میں گھونٹنے کے بعد بولا: "افسوس! تم لوگ بالکل  
پڑتہذب اور گزارہ ہو۔ پتہ نہیں اس حال میں تم جیتنے کیونکہ ہو؟"  
لوگوں نے یہ فتویٰ (؟) سننا اور حیران ہو کر سوداگر کا منہ تکنے لگے۔  
سوداگر نے کہا: "میں نے تمام دنیا کا سفر کیا ہے اور میں نے نہایت عجیب  
غیر اشیاء دیکھی ہیں۔ لیکن ایسا مفلس اور تباہ حال گاؤں میں نے کہیں نہیں دیکھا۔  
لوگوں نے یہ سننا اور کہا: "افسوس! ہمیں یہ معلوم بھی نہ تھا کیا ہم اب مہذب  
نہیں بن سکتے۔"

سوداگر بولا ید مجھے چار آدمی دے دو۔ میں تمہارے گاؤں کے ایک ایک  
آدمی کو مہذب بنادوں گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ آدمی بیکار ہوں۔  
چین گز میں ایک بھی بیکار نہ تھا۔ لوگ مایوس ہو گئے۔ اور بولے: "افسوس  
ہمیں معلوم نہ تھا کہ کبھی ہم کو بیکار دل کی بھی ضرورت پڑ جائے گی۔ وہ نہ ہم انہیں

گاؤں سے کبھی نہ نکلتے۔ لیکن سو دا گرنے تہت نہ ماری اور اپنی ملازمت کے لئے اُنہی میں سے چار آدمیوں کو منتخب کر لیا۔ اس نے کھانے کو پُر لطف کھانے دیئے۔ پہنچنے کو بیش قیمت اور خوبصورت پڑھے دیئے۔ اور کہا۔ جاؤ جا کر گاؤں میں سیر کرو۔ تمہارا یہی کام ہے۔ اور وہ بیکار رہ کر سارا دن گھونٹے پھرنے میں صائم کرنے لگے۔ مگر چند ہی دنوں کے بعد ان کی طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ اور انہوں نے سو دا گر سے کہا۔ یہ ہمیں کچھ کام دے۔ ہم بیکار نہیں رہ سکتے۔

سو دا گر نے مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا اور آہستہ سے رازداری کے لہجے میں کہا۔ تم بڑے آدمی ہو۔ بڑے آدمی کام نہیں کیا کرتے۔ کام کرنا مزدوروں اور قلیوں کا کام ہے۔ بڑے آدمی چھوٹے آدمیوں سے کام کرایا کرتے ہیں۔

چاروں بیکار پہنچ کر کہ اب وہ بڑے آدمی بن گئے ہیں۔ خوشی سے پھولے نہ سماحتے۔ اور پوئے ہم کتنے نیک ہو۔ تم نے ہمیں بڑا آدمی بنادیا ہے۔ اب ہمیں درحقیقت کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم اپنا کام دوسروں سے کرائیں گے۔ لیکن ہمارے پاس اُن کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ ہم کھینچ کر تے ہیں نہ ہمارے پاس انجام ہے۔

سو دا گر ایک مرتبہ پھر اپنے والفریب انداز میں مسکرا یا اور بولا تم بڑے آدمی ہو بڑے آدمیوں کا کام تو لوگ ہفت ہیں بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن یہیں تمہارے لئے دنیا کی بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کو تیار ہوں۔ اس گاؤں کے لوگوں کو بلا کرانے کو کہ وہ ہمارے لئے عالیشان محل تعمیر کریں۔ ہم اُنہیں بالامال کر دیں گے۔"

(سلسلہ)

دوسرے دن پینگر کے لوگوں نے کھیتی کا کام ترک کر دیا۔ اور چار بیکاروں کے مالک سوداگر کے لئے محل بنانے میں مصروف ہو گئے۔ اتنے بڑے محل اس سے پہلے دہائی کسی نے دیکھے ہی نہ تھے۔ ان کو دیکھ کر طبیعت شکستہ ہو جاتی تھی۔ مگر ان کی فصل ماری گئی۔ سوداگرنے لوگوں کو روپیہ دیا۔ لیکن روپیہ سے کسی کا پیٹ نہ بھرتا تھا۔ لوگ زار زار روتے تھے اور کہتے تھے اب کیا ہو گا؟ سوداگر نے ایک بیکار سے کہا۔ ”چھ آدمیوں کو نکر رکھے اُن کو باہر بھیج کر سُستے داموں اناج خرید اور یہاں منگو اکر جائیں گے داموں فروخت کر دے۔ جو پچھے اُسے اپنے لئے رکھ لے۔“

بیکار نے ایسا ہی کیا اور پہلا موقعہ تھا۔ جب پینگر کے لوگوں نے باہر سے آیا ہوا اناج کھایا اور کہا۔ یہ سوداگر کتنا نیک ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا۔ تو ہم اور ہمارے بال پچھے بھوکے مرجاتے۔“

اب اُن کو باہر کی چیزیں اپھی معلوم ہونے لگیں اور اناج منگوانے والے بیکار نے کتنی دیگر اشیاء منگوانی شروع کر دیں۔ کچھ ہی ہمینوں میں وہ امیر بن گیا اور اس نے کتنی دکانیں لھول کر اُن پر اپنے کارندے بھا دیتے۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کرتا تھا۔ اُس کے سب کام دوسرے لوگ کرتے تھے۔

دوسرے سال جب فصل کھڑی تھی۔ تو ایک رات کچھ ہرلن آئے اور فصل کا کچھ حصہ خراب کر گئے۔ سوداگر نے گاؤں کے لوگوں کو گاؤں کے چوک میں جمع کیا اور کہا۔ اس طرح تو یہ جانور تمہاری تمام فصل خراب کر دا لیں گے ماگر تم کہو تو میرا

آدمی انتظام کر سکتا ہے کہ آئندہ یہ ہر ان تمہارے کھیتوں کے پاس نہ چھٹا سکیں۔  
چین نگر کے لوگوں نے کہا۔ ”دیکھو یہ شخص کتنا رقم دل ہے اگر یہ نہ ہوتا۔ تو ہمارے  
کھیتوں کو ہر ان اور دوسرے جانور چڑھاتے ہیں“

دوسرے دن دوسرے بیکار نے گاؤں کے کچھ آدمیوں کو لاٹھیاں دے کر  
کھیتوں کی حفاظت کے لئے کھڑا کر دیا۔ جب فصل کٹ گئی۔ تو اپنے آدمیوں سے کہا  
”نصف انماج میرے پاس اٹھا لاؤ۔ نصف ان کے لئے رہنے والے دو۔ نکر دن نے  
تمیل کی۔ بیکار نے تین حصے اپنے لئے رکھ لئے۔ ایک حصہ نوکر دل کو بازٹا لایا۔  
یہ پہلا موقع تھا۔ جب چین نگر کے لوگوں نے دوسروں کی حفاظت کا آرام  
محسوس کیا اور یہ سوچنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی کہ ہر ان کیا کھا جاتے ہیں اور اب ہم  
نے کتنا دیا ہے۔“

(۳۷)

لیکن لوگوں کو جوانا ج ملا دہ ان کی ضرورت سے کم تھا۔ چین نگر میں چوریاں  
ہونے لگیں۔ کھیتوں کے نام نہاد محافظ نے لوگوں سے کہا۔ ”اگر تم کہو۔ تو ہم نے اپنے  
آدمیوں کو تمہارے مکانوں پر پردیتے کا حکم دے دوں۔ پھر کیا مجال۔ جو تمہارا  
ایک سیر بھی انماج چوری چلا جائے۔“  
گاؤں والوں نے کہا۔ ”بڑی خوشی سے۔“

پس مکانوں اور دکانوں پر پرے دار کھڑے ہو گئے۔ چوری بند ہو گئی۔ مگر  
حافظت کرنے کے اخراجات جو لوگوں کو برداشت کرنے پڑے۔ وہ چوری کے  
نقصان سے کتنی گناہ زیادہ لختے ہیں۔

اس طرح دوسرے بیکار کا کاروبار بھی دن دوپنی رات چونکی ترقی کرنے لگا  
چند ہی مہینوں میں اُس نے بھی اپنے کئی محل کھڑے کرتے۔ مگر وہ خود اپنے ہاتھ  
سے کوئی کام نہ کرتا تھا۔ اُس کے سب کام دوسرے لوگ کرتے تھے۔

کبھی وہ دن لھتا۔ جب چین گر میں سب غریب تھے۔ لیکن کھانے پینے  
کی کسی کو پرواہ نہ تھی۔ اب کاروبار ترقی پڑتا تھا۔ لیکن لوگ بھوکے مرد ہے تھے۔  
نتیجہ یہ ہوا کہ لڑائی جھنگڑے شروع ہو گئے۔ وہ پیار، وہ محبت و خلوص نہ معلوم  
کہاں چلا گیا؟ اب لوگوں کو ایک دوسرے سے ذرا بھی ہمدردی نہ تھی۔ بات  
بات میں سرخپول ہوتا تھا۔ آج یہ زخمی ہو گیا۔ کمل وہ مارا گیا۔ چین گر میں یہ چیزی کا  
ڈور درد تھا۔ سو داگر نے یہ حال زبان دیکھا اور لوگوں سے کہا۔ "اگر تم نے ان  
شکایتوں کا ستد باب نہ کیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارا قدیم اور خوبصورت شہر  
بر باد ہو جائیگا۔ کیا تم کوئی ایسا معقول انتظام نہیں کر سکتے کہ ایسی مددگار  
دار داتیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں؟"

لوگوں نے سو داگر کی طرف دیکھ کر سرخپکالیا اور دھیرے سے کہا۔ "آپ داتا  
میں کچھ آپ ہی بند ولست کر دیں۔ ورنہ ہم سچ مجھ بر باد ہو جائیں گے۔"  
سو داگر نے جواب دیا۔ "اچھا ہم سوچیں گے؟"

دوسرے دن ایک ہماجن اور ایک کسان میں جھنگڑا ہو گیا۔ ہماجن کہتا تھا  
اس کے ذمہ میرا بیس سیراناچ نکلتا ہے۔ کسان کہتا تھا یہ جھوٹا ہے۔ میں نے اس  
سے صرف دس سیراناچ لیا تھا۔ دونوں لوٹتے تھے، جھنگڑتے تھے۔ اور ایک  
دوسرے کو گالیاں دیتے تھے۔ ایک دکاندار نے یہ دیکھا اور چاکر سو داگر کو ٹلکا

## چین نگر کے چار بیکار

دے دی۔ سو و اگر نے اسی وقت ایک آدمی بھیج کر دونوں کو اپنے پاس مُلا جائے تو تیرے بیکار سے کہا " ان کے جھگڑے کا تصفیہ کر دو ॥"

بیکار نے دونوں کی بات چیت سُنی اور پھر کسان سے کہا " تو نے اس سے میں سیراناچ بھی لیا ہے اور اسے گالیاں بھی دی یاں۔ اس لئے میرا فیصلہ یہ ہے کہ تو پچیس سیراناچ دے ॥ "

مہاجن نے خوش ہو کر کہا " کیسا عمدہ فیصلہ ہے میں سیرنا دیتا ہتا۔ اب پچیس سیر دینا پڑا۔ اس کی یہی سزا ملتی ہے ॥ "

کسان نے مجبوراً پچیس سیراناچ منگوا کر سامنے رکھ دیا۔

اب بیکار مہاجن سے مناطب ہوا اور بولا " تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ تو نے اس شخص کو میں سیراناچ دیا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ میں نے دس سیر لیا تھا ॥ "

مہاجن چپ چاپ کھڑا زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے پاس کوئی ثبوت

نہ تھا ॥

بیکار نے کہا۔ تو صرف دس سیراناچ کا حقدار ہے؟ اس سے زیادہ تجھے ایک دانہ بھی نہیں مل سکتا۔ لیکن تو نے اسے گالیاں دی یہیں۔ اور شہر کے لوگ اس کی شہادت دینے کو تیار نہیں۔ گالیاں دینے کا تجھے کوئی حق نہ تھا۔ کیا تیرے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟ ॥

مہاجن چپ چاپ کھڑا زمین کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ بیکار نے کہا میرا فیصلہ یہ ہے کہ تجھے پانچ سیراناچ دیا جائے۔ باقی پانچ سیر چرمانہ کے طور پر کاٹ لیا جاتے ॥

ہما جن انکار نہ کر سکا۔

کسان نے خوش ہو کر کہا: "یکسا عمدہ فیصلہ ہے۔ دس سیرہ لیتا تھا۔ اب پانچ سیر لینا پڑا۔ اس کی بھی سزا ہے"۔

دو گوں نے اس فیصلہ کے دلچسپ حالات مٹنے تو کہا: "ہم کیسے خوشنصیب ہیں۔ اگر یہ شخص نہ ہوتا تو ہم لارڈ کر مر جاتے"۔

اس طرح تیسرے بیکار کا کار و بار بھی چل نکلا۔ اور اس کے پاس بھی کہتی عالیشان اور فلک بوس محل ہو گئے۔ مگر وہ بھی کوئی کام اپنے ہاتھ سے نہ کرتا تھا۔ اس کے سب کام گاؤں کے دوسرے لوگ کرتے تھے۔

(۵)

لیکن ابھی چوتھا بیکار غریب تھا۔

سو دا گرنے اس کے لئے کمائی کا ذریعہ پیدا کرنے کی بہت کوشش کی۔ سچ سوچ کر اس کے سر میں درد ہونے لگا اور اس کی کن پیاں پھٹنے لگیں۔ لیکن اُسے اس تاریکی میں کوئی رستہ نہ سوچا۔ آخر ہار کر دہ اپنے مرتبی و آقا شیطان کے پاس گیا اور تین سال کی کار گزاری سندا کر بولایہ گاؤں کی نہیں چوتھائی آبادی پر ہمارا قبضہ ہو چکا ہے۔ لیکن ابھی ہمارا چوتھا بیکار خالی بیٹھا ہے۔ اگر اس کے لئے کوئی مونوپ کام نہیں آتے۔ تو یقیناً چین نگر کا ایک ایک آدمی ہماری مٹھی میں ہو گا۔

شیطان نے اپنے نائب کی پیٹھ پر آہستہ سے تھیکی دی اور اپنی گول گول اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا: "جاوہ چاکر دہاں لو ہے کی ایک پی گاؤ۔ باقی میں خود سمجھو لوں گا"۔

چین نگر کے چار بیکار

چند دن کے بعد چین نگر کے باہر ایک وسیع میدان میں وہے کی چلی گئی۔ اور رات کے وقت شیطان نے آکر اپنی شیطانی طاقت اُس میں داخل کر دی۔ دوسرے دن چکی نے گیہوں اور باجرہ اور ملکی اور چنے پیشنا شروع کر دیا اور یہ آٹھا اتنا مہین اور آٹھا نفیس تھا کہ گاؤں کے گنوار لوگ حیران رہ گئے۔ — انہوں نے ایسا آٹھا آج تک کبھی نہ کھایا تھا۔ ایک ہی دن میں چین نگر کی سینکڑوں پتھر کی چکیاں بیکار ہو گئیں اور ایک ہی دن میں چین نگر کی سینکڑوں غریب عورتیں اور بن باب کے پچھے بھوکے مرنے لگے۔ لیکن اور لوگ خوش تھے اور اپنی خوشخبری پر چھوٹے نہ سماتے تھے۔ چوتھا بیکار سامنے تخت پر شر پر مبیٹ کر حصہ پتیا رہتا تھا۔ اور رات کے وقت اتنا کما کر رہتا تھا۔ جتنا قصیر کا کوئی کام کرنے والا نہ کہا تھا۔ اُس نے سو داگر کے مشورہ سے کہی اور کلیں لگائیں اور گاؤں کے کہی اور مزدوروں کو بھی دانے والے کا محتاج کر دیا۔

اس طرح شیطان کی هر بانی سے چوتھا بیکار بھی چند ہی دنوں میں دو لمبے ہو گیا۔ لیکن وہ بھی اپنا کوئی کام اپنے ہاتھ سے نہ کرتا تھا۔ اُس کا سب کام گاؤں کے دوسرے لوگ کرتے تھے۔

چین نگر آج بھی اُن پہاڑیوں کے درمیان اسی طرح آباد ہے۔ اب وہاں دیکھنے کے قابل کہی عمارتیں بن گئی ہیں۔ وہاں عدالتیں ہیں، وہاں شفاخانے ہیں، وہاں سراتیں اور دھرم سالے ہیں، برٹے بڑے کار فانے ہیں۔ اور پچھے اُوپنے محل ہیں۔ اگر کوئی مسافر اُدھر جان لختا ہے تو اس شہر کی عظمت دیکھ کر اُس کی طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ اس کے دل کا گنوں کھل جاتا ہے۔ لیکن اب وہاں

کا قانون تبدیل ہو گیا ہے۔ پہلے سب کام کرنے والے کھاتے تھے۔ صرف چار بیکار بھوکے مرتے تھے۔ اب چار بیکار عیش کرتے ہیں۔ باقی سب کام کرنے والے بھوکے مرتے ہیں +



صحافی

نبیر سنگھ و پیر

ہیلو۔ ہیلو۔ کیا یہ پیام وطن کا دفتر ہے؟ آپ نہیں؟ اسلام علیکم  
ایک بڑا صاحب! ماں۔ ماں۔ نہیں ہوں۔ امیر حسن ڈپٹی مکشفر۔ نہیں کوئی  
خاص بات نہیں ہے۔ آپ کے اخبار کی آج اشاعت میں ایک فلم شائع ہوئی  
ہے۔ "جنون صحراقی"۔ نیچے لکھا ہے۔ از جناب صحراقی یہ صحراقی کون ہے؟ نہیں کوئی  
خاص بات نہیں۔ میری لڑکی ابینہ ہے نا۔ آپ نہیں جانتے وہ اس باری۔ لے  
میں اردو میں اول رہی ہے۔ ماں وہی۔ اُس نے اس نظم کو پڑھا۔ میرے پاس  
لاقی۔ نہیں نے پڑھا۔ کچھ شوق رکھتا ہوں۔ ماں۔ آپ لوگوں کی نوازش ہے۔ ادا!  
نہیں۔ من آنم کہ من دانم۔ لیکن نظم خوب لکھی ہے۔ سوچا آپ سے دریافت کر کے  
صحراقی صاحب کو گھر بیلانہیں۔ کچھ اور کلام میں۔ نہیں؟ کیا کہا؟ افسوس ہے۔  
پھر کیا ہو سکتا ہے۔ پرانوں نے اپنا پتہ نہیں لکھا۔ لفافہ نہیں دیکھا۔ آپ نے پہنیک  
دیا؟ لکھتا خوب ہے۔ اچھا کبھی پتہ لگے گا تو مجھ سے فرمائیں گا۔ علیکم اسلام۔  
— شکریہ۔ ہمرا فی۔

اور ڈیلیفون کا چونگا ہاتھ سے رکھتے ہوئے مسٹر امیر حسن نے کہا۔ "صحراقی کا کچھ  
پتہ نہیں لگا۔ معلوم ہوتا ہے۔ ابینہ ادا کو قسمی شاعر ہے۔ ایک اچھی نظم کہہ دی ہے،  
درستہ ہمیشہ اچھی نہیں کہتا ہو گا۔ اسی لئے ادبی دنیا اس سے محدود نہیں ہے۔"

ایمنہ نے آہتہ سے کہا۔ ”میں تو ایسا نہیں سمجھتی ہوں آب مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آدمی سہیشہ ہی سے اچھا لکھتا رہا ہے۔ آپ اس کے خیالات نہیں دیکھتے ہیں؟ یہ تجھیں ایک دن میں پیدا نہیں ہوتا۔ یہ جذبات ساداں کے بادلوں کی طرح آسمان سے دل میں نہیں آتے جنون صحرائی۔ دنیا کے اعلیٰ ترین گنیوں میں سے ہے گا۔ امیر حسن ان چند سند و متنیوں میں سے تھے جنہیں ڈپٹی مکشنری نے کامیاب حاصل ہوا ہے لیکن شعروبریت سے انہیں ایک عجیب انس تھا۔ اس لئے بیٹھی کو اس طرح کی شاعرانہ گفتگو کرتے سن کر انہوں نے پر تعریف نکالا ہوں تے اس کی طرف دیکھا اور آہتہ سے کہا۔ تم اُردو ادب کے اول تریں مبصروں میں ہو گی۔“

ایمنہ نے الجا کر کہا۔ ”پنگوئن دنیا کا آسان تریں شغل ہے۔“

اور وہ سنس پڑھی۔

اور امیر حسن بھی سنبھلنے لگے۔

(۴)

لیکن ڈپٹی مکشنری امیر حسن اور ان کی بیٹی ایمنہ ہی صحرائی کے لئے بیقرار ہوں سویہ بات نہ بھتی شہر میں کتنا ہی آدمی اُس کے لئے بتاب پختے ہی پیام وطن کے ایڈب میر مسر قدر وائی ملکیوں کی گھنٹی سنتے سنتے شنگ آگئے تھے۔ ہر بارہ ہی سوال ہوتا تھا۔ یہ صحرائی کون ہیں؟ اور ہر بار میر مسر قدر وائی افسوس کے ساتھ کہتے تھے میں جانتا نہیں ہوں۔ لفاظ میں ایک نظم آئی بھتی۔ شائع کردی۔ ہاں لکھتا ہے اچھا ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ کمال کر دیا ہے۔“

لیکن قدر وائی بہت تنگ نہیں آتے تھے۔ جتنے زیادہ سوال ہوتے تھے۔ اتنی ہی مسٹر ہوتی تھی۔ ان کے اخبار میں ایک ایسی چیز شائع ہوئی تھی جس کے لئے شہر کا شہر پتیاب ہوا تھا۔ کیا یہ فخر کی بات نہ تھی۔ مگر وہ خود اپنے آپ سے سوال کرتے تھے یہ صحرائی کون ہے؟

تب انہیں ایک بات پیدا آئی۔ اُنھوں کو روزی کی ٹوکری کے پاس گئے پورانے کاغذوں میں اس لفافے کو تلاش کرنے لگے جیسیں قائم آتی تھی۔ لیکن کافی پریم تک ہمڑی پھر کرنے پر بھی وہ لفافہ نہیں ملا۔

تب انہوں نے افسوس کے ساتھ کہا۔ صحرائی پیدا بھی ہوا اور مر بھی گیا۔ اب شاید اس کی کوئی نظم نہیں آتے گی۔

لیکن ایسا ہوا تھیں۔ دوسرے ہفتے، سندھے اپڈیشن شائع ہونے سے ایک دن پہلے ”پیام وطن“ کے ذفتر میں ایک لفافہ آیا۔ اس پر زمانہ حروفت میں لکھا تھا:-  
مدیر ”پیام وطن“

لاہور

اور لفافے کے ایک کرنے میں لکھا تھا:-

از ”صحرائی“

مسٹر قدر وائی نے پتیابی سے لفافہ کھولا۔ کاپتے ہوتے ہاتھوں سے۔ اس میں ایک اور نظم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نہایت نازک ہاتھ سے لے لکھا ہو۔ حروفت کی بتاولٹ میں ایک حُسن تھا۔ ایک معصومیت سی تھی۔  
لکھا تھا۔

”خدمت میں یہ ناچیڑا شعارات سال بیس۔ آپ نے پچھلے اشعار کی قدر افزائی کی تھی۔ اسی لئے ان کو بھی ارسال کرنے کی جوائز کی لئی ہے۔ فقط

ممنون

”صحراً“

اور اس خط کے ساتھ ایک نظم تھی جس کے اشعار تو اب بھول گئے ہیں لیکن خیالات اب بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ کچھ اس طرح کے خیالات تھے۔

دہ شباب کے گناہ کی طرح حسین تھی۔ اور فراق دوست کی طرح دلوں۔ اس کی آواز میں موسیقی تھی۔ اور موسیقی میں شراب۔ اس کی آنکھوں میں بھول تھے اور بھولوں میں سانپ۔ دہ رقصہ تھی۔ اور دوسرے نے پڑھا اور جھووم گئے۔ باہر پڑھنے لگے۔ دہ شباب کے گناہ کی طرح حسین تھی اور فراق دوست کی طرح دلوں اُف! کیا تخیل ہے؟ کیا سادگی ہے؟ — شباب کے گناہ کی طرح حسین۔ اور دوسرے دن شہر بھر جھووم رہا تھا۔ ”پیام وطن“ کا منڈے ایڈلشیں صبح اپنے شائع ہوا۔ اور پونے سات بجے دفتر میں ایک بھی کاپی نہ تھی۔ فائلوں میں میں پہچے نہیں ڈالے گئے تھے۔ اور اب بھی مانگ تھی۔ میسجر نے تنگ آ کر اپنے ٹیلیفون کا چونگا آتا کر نیچے رکھ دیا۔

اور شہر میں مہرآدمی کی زبان پر صحراً کی نظم تھی۔ صحراً۔ صحراً۔ چاروں طرف سے سنائی دے رہا تھا۔ لوگ اس کی نظم کو پڑھ پڑھ کر جھووم رہے تھے۔ اور جھووم جھووم کر پڑھ رہے تھے۔ (۱۱)

اینہ عبلدی سے ڈپٹی مشتر صاحب کے مرے میں آئی۔ اور بولی۔ ”آپ نے

دیکھا ہے؟"

امیر حسن نے پر تجھیں نگاہوں دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھا ہے۔ اس باراں نے پہلے سے بھی کمال کر دیا ہے تپہ نہیں وہ انسان ہے کہ جادوگر....." ایمینہ نے سنبھال کر کہا۔ "لیکن سب سے بڑا کمال یہ ہے۔ کہ وہ دنیا کو شریت سے منور کر رہا ہے۔ مگر خود چھپ گیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں۔ آبا صحرا۱ کے پایہ کا شادر ان دونوں اس ملک میں اور نہیں ہے۔"

امیر حسن نے کہا۔ "ااں جہاں کہیں بھی وہ ہے۔ جو کوئی بھی وہ ہے۔ وہ لاثانی شاعر ہے۔ مگر وہ کیوں ایمینہ! — شاید اس بالہ قدر دائیٰ کو کچھ معلوم ہوا ہو۔" ااں ااں۔ "ایمینہ نے کہا۔ دریافت تو کیجئے!"

لیکن ڈپٹی لکشنر صاحب کا چہرہ افسردہ دیکھ کر ایمینہ نے سمجھ دیا۔ کہ ٹیلیفون پر کوئی بھی معینہ مطلب اطلاع نہیں ملی۔ امیر حسن نے دھیرے سے کہا۔ مسٹر قدر دائیٰ لکھتے ہیں پہلے میرا خیال تھا کہ وہ مرد ہے۔ لیکن اب ہیں اس بات کو بھی ثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ صحرا۱ مرد ہے یا عورت۔ ااں وہ نہایت نازک دلخیل کا شخص ہے جو کوئی ہے۔ نفاست اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

ایمینہ نے آہستہ سے کہا۔ میں تو پہلے ہی سمجھتی تھی۔ اس کے خیالات کتنے نازک ہیں۔ لیکن وہ مرد ہے یا عورت۔ اس کے متعلق ہیں جانتی ہوں۔ کہ وہ کیا ہے....؟"

امیر حسن۔ "کیا ہے؟"

ایسے۔ ابھی نہیں۔ ابھی نہیں بتاؤں گی۔ دو چار دن بھیر جائے گا۔۔۔۔۔ میں صورت ہوتی تو آج صحراٰ کی تصور پہنچ کر بتاویتی کہ یہ صحراٰ ہے۔ لیکن ابھی نہیں۔۔۔۔۔

(۳)

سو مواد کو ”پیام وطن“ میں ایک نوٹس تھا۔ علی ہدوفت میں لکھا تھا:-  
صحراٰ!

آپ کی دو نظمیں ”پیام وطن“ میں شائع ہو چکی ہیں۔ آخر نظم ”رقاصہ“ کے عنوان سے۔ ادبی دنیا آپ کا نیا رہ حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ لیکن کسی کو آپ کا کچھ نہیں پڑھا ہے۔ اسلئے آپ جہاں کہیں بھی ہیں۔ براہ کرم ”پیام وطن“ کے دفتر میں یا تو خود تشریف لانے کی تکلیف کو ادا کیجئے۔ یا اپنا پتہ ارسال کیجئے۔ ہم جانتے ہیں۔ باحکمال لوگ عوام کے سامنے آنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس تعارف کے لئے ادبی دنیا آپ کی بے حد منون ہو گی۔

قدروائی مدیر ”پیام وطن“

اس نوٹس کا کافی ویتنک کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ قدر وائی کی منتظر نگاہوں نے کسی بھی نجیف ولا غر شاعر کو ”پیام وطن“ کے دروازے سے اندر آتے اور میں صحراٰ ہوں۔ قدر وائی کو ملنا چاہتا ہوں۔ کہتے نہیں دیکھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے چاتے تھے۔ قدر وائی کی امیدیں خاک میں ملتی جاتی تھیں۔ بار بار وہ اپنے کو جواب دیتے تھے۔ نہیں۔ ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ نہیں۔۔۔۔۔ پتہ نہیں اب کیا کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔

لیکن شکردار کو و فریبیں پھر ایک افافہ موصول ہوا۔ اسی زمانہ سے نازک دستخط میں قدر دائی نے اُسے دیکھا۔ تو خوشی سے اُچھل ٹپے۔ لیکن اُسے کھولنے سے پہلے جلدی سے ٹیلیفون کے چونگے کو اٹھایا۔ ڈائل کو لکھایا اور کہا۔ — ہیلو ہیلو  
مس ایمنہ!... ہاں... ہاں... مس ایمنہ کو بلاد و بھائی — نہیں جلدی سے بلادو۔ میں بند نہیں کرتا ہوں۔ جلدی کرو — ہاں۔ ہاں۔ میں ہوں قدر دائی صحرا کا خط آگیا ہے۔ بتاب نہیں ہو جئے۔ ابھی میں نے خود بھی پڑھا نہیں ہے۔ نظم کا پتہ نہیں۔ کھولا بھی نہیں ہے۔ لیجھے کھولتا ہوں۔ ہاں دہی لکھا ہے۔ مشق مدیر عمارت! عزت کامنون ہوں۔ مجھ غریب کو شہرت کی ضرورت نہیں ہے۔ تہ ہی میں اپنے آپ کو شاعر سمجھتا ہوں۔ ہاں۔ ہاں۔  
یہی لکھا ہے۔ نہیں اپنے آپ کو شاعر سمجھتا ہوں۔ آجھل کشمیر میں رہتا ہوں۔ ہاں۔ کشمیر میں۔ آج یہاں ہُن سے یہ مارسلہ پرست کرتا ہوں۔ جمل کہاں ہوں گا اس کا مجھے خود علم نہیں ہے۔ بھی واپس آیا تو نیاز حاصل کر دیں گا۔ ایک گپت ارسال ہے۔ میں نے تو عنوان رکھا ہے: "پیام وطن، اگر یہ اچھا نہ ہو۔ تو اور رکھ لیجھے۔ آپ کامنون... صحرا از من کشمیر... ہیلو۔ اور اس کے ساتھ یہ گپت ہے۔ ہاں سُنا تا ہوں۔ ہیلو۔ ہیلو۔ مس ایمنہ۔ ہیلو۔  
لیکن چونگے کو بلاؤ کر مسٹر قدر دائی نے دیکھا کہ ٹیلیفون کی بچی ختم ہو گئی ہے۔ اور دوسرے دل سندھے ایڈیشن میں مرٹے ہو دف میں ایک چار کالمی بُرخی تھی مشهور شاعر صحرا۔ آجھل کشمیر جنت نظیر میں سیر و سیاحت کر رہے ہیں

دنیا کے محبوب تریں شاعر کا آخر کار پر چلا  
 صحرائی کہتے ہیں میں سو شعر نہیں  
 ان عنوانات کے نیچے صحرائی کا مکتوب تھا۔ اس کے بعد وہ گیت تھا جس  
 کا عنوان تھا۔ ”پیام وطن“ اس کے بھی اشعار تو بھول گئے ہیں۔ مطلب کچھ اس  
 طرح تھا:-

پڑ مردہ بھولوں ہیں اس کی بُردھی آنکھیں ہیں۔ جو شنبہ کے آنسوؤں سے  
 پڑ ہیں۔  
 آبشاروں کے روتنے ہوئے گیتوں میں اس کی صدائیں ہیں۔ جو چٹاؤں  
 کے بڑھاپے میں ڈمگنا رہی ہیں۔  
 خزان کے اشجار کی شاخوں میں اس کی انگلیاں ہیں۔ جو ہوا کی ضعیفی میں  
 کانپ رہی ہیں۔  
 اُسے اپنے عزیز بھوپل کا خون در کار ہے۔

کوئی ہے؟

اور اس کے نیچے اپدیٹر کی طرف سے ایک اور نوٹس تھا۔

آفتاب ادب صحرائی!

آپ کے مکتوب گرامی سے آپ کا کچھ خاص تپہ نہیں چلا۔ آپ کشیر میں تو  
 ہیں۔ پر کہاں ہیں؟ دنیا آپ کے لئے بیقرار ہے۔ اس پر حکم کیجئے اور لاہور میں  
 آجائیے!

مدیر ”پیام وطن“

(۴)

اور اس وقت انجمن ادب میں بھی صحرا فی کا ہی چہرہ چاہورہ ماتھا۔ انجمن کے صدر مسٹر عبد اللہ کہہ رہے ہیں تھے۔

ہاں۔ تو آج کے جلسے میں انجمن نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ ہر پانچ برس کے بعد انجمن کی طرف سے بہترین ادبی چیزیں چودھر کا انعام دیا جاتا ہے۔ وہ اس بار اس عجیب شخص صحرا فی کو دیا جائے۔۔۔۔۔ لوگوں کی کئی سو صفات کی کتابیں اس کی چند سطحی نظموں کے سامنے بیچ سمجھی گئی ہیں۔۔۔۔۔

«لیکن اس کا تو کچھ پتہ نہیں چلتا؟»

یہی تو ہم بھی سوچ رہے ہیں کہ اُسے انعام کیسے دیا جائے۔ «پیام وطن» میں شائع کر دیں گے۔ امید ہے وہ آجائے گا۔

لیکن میں تم سے ایک بات کہوں۔ عبد اللہ امیرے خیال میں یہ صحرا فی کوئی بہت بڑا مشری سوداگر دیوانہ وحشی سا آدمی ہے۔

اور تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہاری طرح وہ بہنباپ کی حسین تریں آنکھوں کا مالک ہے، تمہاری ہی طرح عودتیں اس کے لئے مرتی ہیں خاور بھائی؛ وہ تو ویسا ہی ہو گا جیسے شاعر ہوتے ہیں۔ لا پرداہ۔۔۔ پاگل۔۔۔ سوداگر۔۔۔

لیکن عبد اللہ اس پاگل سوداگر کو اتنی عزت اور اتنے روپے کی کیا ضرورت ہے؟ «پھر کس کو ضرورت ہے؟

«مجھوں کو۔»

«تم کو۔ خاور؟»

ہاں مجھ کو میری بات سنو۔ میں صحیح سے سوچ رہا ہوں۔ کہ نہیں پچھلے سے کثیر چلا جاؤں۔ دہاں سے پیام وطن والوں کو خط لکھ دوں۔ کہ نہیں آپ کی خواہش کے مطابق واپس آ رہا ہوں۔ تم لوگ استقبال کے لئے سیشن پر آنا اور ٹرین آنے سے تھوڑی دیر پہلے ان کو بتا دینا کہ صحرائی دراصل کون ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لوگ فخر کے لگائیں گے۔ نہیں کہوں گا۔ کہ نہیں نے عبد اللہ سے سمجھا یا تھا کہ میرے پہنچنے سے پہلے وہ کسی کو اس راز سے آگاہ نہ کہے ہے۔ — اپر پھر —

”پھر دولت اور عزت تمہارے پاؤں چوٹی میں گی۔ لیکن یہ اچھا نہیں ہے خاور“  
تمہارا دعوظ مُستَنبتے کو نہیں آیا۔ تم میرے دوست ہو۔ میں تمہاری  
مد و چاہتا ہوں۔“

خادر ان لوگوں میں سے تھا جن کی بات سے انکار کرنا مشکل نہیں ناممکن ہوتا ہے۔ عبد اللہ نے دھیرے سے سر بلادیا۔ اور کہا یہ جو مراجی باریں آتے۔“

(۶۷)

مندرجہ بالا داقعہ کے کوئی سات دن بعد پیام وطن کے دفتر میں ایک خط موصول ہوا۔ ان ہی پڑائے نازک سے دستخطوں میں جن کے الفاظ نہایت بنا بنا کر ملکے گئے تھے۔ جیسے کسی زوجہ ارشیک نے اپنے محبوب کو لکھے ہوں۔ —  
لکھا تھا:-

”دوست!

خدمت میں ایک آبشار ارسال ہے۔ لاہور آنے کے متعلق کچھ نہیں کہ سکتا۔ اگر آؤں گا۔ تو آپ کو اعلام دوں گا۔ صحرائی؟“

قدر و اُن نے اینہے کو میں یقون پر آبشار رُسنا یا۔ اس نے کہا۔ میں حیران نہیں ہوں۔ وہ آدمی دنیا کا بترین شاعر ہے۔ اگر دہی ایسی چیزیں نہ لکھیں گا۔ تو اور کون لکھے گا۔ اور پھر اس نے جا کر ڈپٹی صاحب سے کہا۔ آباجی! اس دن میں نے کہا تھا کہ صحراٰئی کی تصویر کھنچ سکتی ہوں۔ آج بتاؤ! وہ تصویر کیسی ہے؟

ڈپٹی لکشنر نے دھیرے کہا۔ ” بتاؤ!“

ایمنہ نے کہا۔ ”آباجی! وہ ایک نہایت خوبصورت آدمی ہے۔ اس کی آیسی حسن سے محمور ہیں۔ اور اس کی آواز متناگلی لئے ہے۔ اس کا دل کسی ناکام محبت سے بھرا ہے۔ اور اگر وہ اتنے اعلیٰ پایہ کا شاعر نہ ہوتا تو اب تک مر جکا ہوتا۔ جس وقت اینہے جو شر کے ساتھ ان الفاظ کو کہہ دیتی ہے۔ اسی وقت ڈپٹی لکشنر میر حسن نے دیکھا۔۔۔ ان کی بیٹی کی آنکھوں میں اس نامعلوم شاعر صحراٰئی کی محبت رقصائی ہے۔

اور میر حسن نے کچھ غلط نہیں سمجھا تھا۔ کتنے ہی دن سے اینہے اس خوبصورت آدمی کے خواب دیکھا رہی تھی۔ جو کشمیر کی وادیوں میں ایک خوش المahan ملیل کی طرح گاتا پھرتا ہے جس کی صدای میں سوز ہے جس کے اشعار میں حسن ہے جس کی آنکھوں میں لا انتہا شراب ہے۔

جس آبشار کو سن کر اینہے نے صحراٰئی کی تصویر مکمل کی تھی۔ وہ عام زبان میں کچھ اس طرح تھا:-

تم کون ہو؟

کس کی یاد تھیں رات سے دن تک اور دن سے رات تک رُلا یا کرتی ہے؟

ان پتھروں چنانوں جھاڑیوں اور بیلوں کی پیچھے تم کسے تلاش کرتے پھرتے ہو؟

کیا تمہیں بے دفاس سے اُفت ہو گئی ہے؟

اکٹھا رہو صول ہونے کے نین دن بعد "پیام وطن" کے دفتر میں ایک اور لفافہ آیا۔ تھا تو کشیر سے یہیں دستخط صحراً کے نہ تھے۔ قرداہی نے کھولا۔ پڑھا لکھا تھا:-

مشتر قدر دوائی!

آپ میرے دستخط دیکھا کر حیران ہوں گے یہیں یہی میرے ہمی دستخط ہیں۔ یہیں خود ذرا لکھنے سے جی چڑتا ہوں۔ اسلئے پہلے خطوط اپنے سکرٹری سے لکھواتا تھا۔ آج اس سکرٹری کو ایک خاص وجہ سے نکال دیا ہے۔ یہاں سکرٹری ابھی کوئی نہیں ملا۔ اس لئے خود ہی اس خط کو لکھ رہا ہوں۔ سکرٹری کا دستخط تو اچھا تھا۔ یہیں وہ کچھ خوبی سا آدمی تھا۔ اچھا تو یہیں آپ کو بتاؤں۔ آپ مجھے جانتے ہیں بلہ ہو کے اور بھی کئی اصحابِ مکتبی سے واقف ہیں۔ یہیں کون ہوں۔ یہ لاہور میں آکر بتاؤں گا۔ لاہور کب آؤں گا۔ اس کے متعلق ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آنے سے پہلے اطلاع دوں گا۔

آپ کا خیراندیش  
"صحرا"

اس شام کو لاہور بھر کے ادبی حلقوں میں صحراً کے متعلق اس نئی اہمیت پر قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ لوگ سوچ رہے تھے۔ تو وہ ایک امیر آدمی ہے۔ سکرٹری کہتا

ہے۔ کشمیر کی بیکر کرتا ہے۔ مزے سے رہتا ہے۔ اور اپنہ سوچ رہی تھی۔ میرا خیال دست  
ہے۔ غریب آدمی اتنا خوبصورت نہیں ہو سکتا۔ اور خیال ہی میں وہ اس نامعلوم  
شخص سے باقیں کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ آپ کب آئیں گے؟ کیا آپ کو معلوم  
نہیں کہ کوئی آپ کے انتظار میں پریقرار ہے؟

(۹)

میں دن بعد ایک خط موصول ہوا۔ اسی زمانے سے نازک سے دستخط میں اس  
الفاظ میں جن سے موسیقی ٹپکتی تھی۔ اور شعریت برستی تھی۔ لکھا تھا:-

”مردان مدیر پیام وطن

آپ کے اصرار پر لاہورہ آ رہا ہوں۔ لیکن دل کا پوتا ہے صحرا فی کو شروع سے  
کیا رشتہ ہے، صحرا فی کو شہرت و عزت سے کیا واسطہ ہے۔ جنگل ہیں۔ بیان ہیں۔  
کوہستان کی فلک شگاف پڑیاں ہیں۔ وہ دلہنیں ہیں۔ اشجار ہیں۔ وہ سامعین  
ہیں۔ آبشار ہیں وہ ساختی ہیں۔ گھٹائیں ہیں وہ پیام ورد ہیں۔ پر پھر بھی آتا ہوں۔  
دیکھوں کہ پے گیا کہتے ہیں۔ اس جمادات کو فرانٹیشنری میل پر۔ امید ہے۔ جب  
آپ کے دفتر میں آؤں گا۔ تو آپ اس آدمی کو پہچان سکیں گے۔ جسے آپ نے  
اتنا پذیر نام کر دیا ہے۔

صحرا فی“

قدر دائی جیران ہو رہے تھے۔ کہ یہ صحرا فی کو پھر کیا ہو گیا ہے۔ کیا اس نے اپنا پرانا سکری  
پھر لکھ لیا ہے۔ آخر بہت سوچ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہی تھے۔ کہ صحرا فی نے اپنے  
سکریٹری کو پھر لکھ لیا ہے۔ کہ تاریخ کا چپراسی ایک تاریخیکر آیا۔ قدر دائی نے تاریخ کو پڑھا

صحراٰئی نے بھی بھی تھی۔ لکھا تھا:-

”سب کو سلام کئے۔ صحراٰئی“

قدروائی نے ہنس کر کہا۔ صحراٰئی شاید بھول گیا ہے۔ کہ اس نے پہلے خط بھی لکھا ہے۔ اس لئے تاروے دیا ہے۔

(۱۰)

جمعرات کا دن۔ اشیش پاٹنی بھیرتھی۔ کہ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی۔ ریل والوں کو پلیٹ فارم ٹکڑوں کی فروخت بند کر دینی پڑی۔ لوگوں کے ماتھوں میں ارتھ بچوں کے گھرستے تھے۔ پیغمبرؐ تھے۔ وہ بیٹاں سے فرانٹیمیل کا انتظار کر رہے تھے۔

ایک طرف اخوب ادب کی کارکن کمیٹی کے کچھ اراکین تھے۔ قدر وائی تھے۔

ڈپشی کمشنز میر حسن تھے۔ ایمنہ تھی۔ عبد اللہ بھی تھی۔ گاڑی آنے میں الہی کچھ ہی دیر باقی تھی۔ کہ عبد اللہ نے ایک اوپنجی جگہ پر کھڑے ہو کر کہا۔ ”حاضرین!“

پسے تو کسی نے ان کی آواز کو نہیں مل سنا۔ لیکن پھر سب نے کہا۔ چُپ چُپ سُنو سُنو۔ اور تب عبد اللہ نے کہا:-

حاضرین! جس عظیم شاعر کا استقبال کرنے کے لئے آج ہم یہاں آئے ہیں۔ دہاب تک آپ کے لئے ایک رانہ ہے۔ لیکن میں آپ کو تباہا چاہتا ہوں۔ کہ صحراٰئی لاہور کا ہی رہنے والا ہے۔ آپ میں سے بہت سے لوگ اس کو جانتے ہیں۔

لوگوں نے جراںگی سے عبد اللہ کی طرف دیکھا۔ عبد اللہ نے ذرا ہٹیر کر کہا آپ شن کر جیاں ہوں گے۔ کہ صحراٰئی اور کوئی نہیں۔ آپ ہی کے شر کا ایک

نوجوان ہے۔ اور اس کا اصلی مخلص خادر ہے۔

”خادر؟“ کتنی ہی زبانوں نے چرٹ سے کہا۔

عبداللہ نے کہا ہے۔ ”خادر۔ وہی صحافی بھی ہے۔ وہی اس فرانشیز میبل سے آ رہا ہے۔“

اسی وقت فرانشیز میبل کی آواز آنے لگی۔ اور تھوڑی ہی دیر کے بعد گماڑی پلیٹ فارم پر آگئی۔

سینکندہ کلاس کے ایک لڑکے باہر اتنی بھیرتھی۔ کہ لوگ پسے جا رہے ہی تھے اور دوسرے میں خادر کھڑے تھے۔ پھولوں سے لدے ہوئے مسکراتے ہوئے۔ اپنی ان جیں انگھوں سے دلوں کو قابو میں کرتے ہوئے۔

ڈپٹی کمشنر یہ حسن نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں نیچے آثار اور کہا۔ آپ نے ادب کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ یہ سب لوگ آپ کے اشعار پڑھ کر دیوانے ہوئے ہیں لیکن مجھے یقین ہے جب ان میں سے کوئی بھی نہ رہے گا۔ جب نہ ہم ہیں گے نہ آپ۔ اس وقت بھی لوگ آپ کی چیزیں ڈپٹی کمشنر سر دھنا کریں گے۔ خادر نے خوشی سے سرخ ہو کر سر جھوکا دیا۔

ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ آپ لا ہو میں رہتے ہیں لیکن ایک ہفتہ بھر میں آپ کو اپنے مرکان پر رکھنا چاہتا ہوں۔“

ایہ نہ سحر کئے ہوئے کی طرح کھڑی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا وہ سوچ رہی تھی۔ شاپیں صحرائی انکار کر دیں گے

لیکن خادر سے بھی پہلے مسٹر عبید اللہ نے کہا۔ انہیں کیا انکار ہو گا۔ بنده پر دریکوں خادر؟

خادر نے آہستہ سے کہا۔ "جیسے آپ کی مرضی!"

اور اسی وقت فودر پرے گاڑی کے آخری تھرڈ کلام کے وہ بے میں ایک پست قامت سا شخص ایک عمری سا بستر اٹھاٹے باہر نکلا۔ اس کی آنکھیں خوفناک درندوں کی تھیں۔ اور چہرہ ایسے تھا جیسے دنیا بھر کی بد صورتی اس میں بھروسی گئی ہے۔

اُس نے ایک قلی سے دریافت کیا۔ یہ آتنی بھیر کا ہے کی ہے؟  
قلی نے مشتبہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک بیت باز آیا ہے اسے لو اُنے کوشروا لے آئے ہیں۔ سرافی اس کا نام ہے۔

"صحراٹی؟ شاعر صحراٹی؟"

ہاں۔ ہاں سترائی۔ جسے ہم لوگ بیت باز کہتے ہیں۔ اسی کو وہ سائز کہتے ہیں۔  
وہ پست قامت شخص بھیر کے نزدیک گیا۔ ایٹھر یاں اٹھا کر اس نے خادر کو دیکھا۔ اور پھر آہستہ سے کہا۔ آپ صحراٹی ہیں؟"

ایک بارہ اُس کا چہرہ سُرخ ہوا۔ آنکھوں سے خون پرنسے لگے۔ لیکن معاً اُس نے ایڈنر کو دیکھا اور جیسے یہ کا یک سورج غروب ہو جانے سے شفق کی سُرخی زد ہو جاتی ہے۔ اُس کا غصہ بھی ختم ہو گیا۔ ایک بھوکے آدمی کی طرح وہ اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ تب یہ کا یک اُس کی آنکھیں اتنی خوبصورت دلھاتی دینے لگیں۔ کہ بیان بھی نہیں ہو سکتیں۔

لیکن اسی وقت بھیر میں محلِ محی۔ لوگ ایک طرف کو چل کر ٹے ہوئے خاور بھی چل دیئے۔ اور اس ریل پلی میں اس پست قامت شخص کو کہتے وہ کہے پڑے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

(۱۶)

دوسرے دن شام کو باول برس رہے تھے۔ اور کبھی کبھی گرج سُناٹی دیق تھی ساون کی جھٹری لگی ہوئی تھی۔ خاور ڈپٹی کمشنر میر حسن کے بنگلہ میں ایک برآمدہ میں ٹھیٹھے۔ میر پر کہتے ہی دعویٰ خطوط تھے لیکن خادم کا دھیان اس وقت ان کی طرف نہ تھا وہ سوچ رہے تھے۔ کہ اپنے کتنی خوبصورت ہے؟ اس کے بال کہتے کالے ہیں؟ اُس کی زبان میں کتنی مٹھاں ہے؟ جب سے انہوں نے اس کو دیکھا تھا۔ تب ہی سے پتہ نہیں کیا ہوا ہے۔ وہ عزت اور شہرت کے پرے اپنے اپنے ہی کے بھگت ہو گئے تھے۔

اس وقت ذکرنے آگر کہا۔ آپ کے ملنے کے لئے ایک آدمی آیا ہے جسما! عجیب وحشی سی صورت ہے۔ وہ کہتا ہے۔ آپ سے ایک ضروری کام ہے۔ آپ ہی سے کہہ سکتا ہے۔

خادر نے ذرا سوچ کر کہا۔ "مجھ سے؟ وحشی سی صورت ہے؟ پیچھے دو! لکھوڑی دیر کے بعد ایک پستہ قامت شخص اندر آیا۔ اس کی آنکھیں درندوں کی سی خوفناک تھیں۔ اور چہرے میں عالم بھر کی بد صورتی بھری تھی۔ اس کے پرے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ بہت اچھی حالت میں نہیں ہے۔" خادر نے کہا۔ "آپ مجھے ملنا چاہتے ہیں؟"

نو آمدہ نے کہا۔ "ماں آپ ہی سے"

خادر نے اُسے کرسی پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کہا۔ "آپ کون ہیں؟"

نو آمدہ نے آہستہ سے کہا۔ "میں وہی ہوں جو کچھ آپ اپنے کو ظاہر کر رہے ہیں"

"کون؟" خادر نے کرسی سے مسحچل کر کہا۔

"وچونکے نہیں" فرآمدہ نے کہا۔ "میں صحراٹی ہوں۔ آپ اس امر سے بخوبی

واقت میں کہ آپ صحراٹی نہیں"

خادر نے تڑپ کر کہا۔ "تم حجوم بختے ہو۔ یہاں سے نکل جاؤ"

صحراٹی نے دھیرے سے کہا۔ آپ کی عزت و شہرت پافی کے ایک بیلبکے کی طرح ہے۔ ذرا سی ہوا لگتے سے وہ پھٹ جائیں گی۔ اگر آج ہی کوئی آپ سے نہیں نظم کہنے کو کہیں گا۔ تو تباہ سکتے ہیں۔ آپ کیا کریں گے؟ خادر نے کچھ سورج کر کہا۔ صحراٹی! میں تم سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ دنیا تمہارے لئے شر ہی ہے پاگل ہو رہی ہے۔ اتنی عزت کی لیکر تم کیا کرو گے۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ پہلے بھی لھتی۔ اور اب تو....."

صحراٹی نے جانی سے کہا۔ "میں نے اس بات پر بہت غور کیا ہے۔ اس کنگال صحراٹی کو عزت و شہرت سے کچھ سرزد کا رہنیں۔ بلیکن یہاں یہ سورج کو آیا ہوں لکھ آپ کی اس بنی ہوئی عزت کو بگردنے نہ دوں۔ آپ صحراٹی ہئے رہئے۔ میں گیت لکھا کر ذنگا آپ کایا کیجئے۔ مجھے تو کوئی کہ لیجئے۔ کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا۔ کہ آپ اصلی صحراٹی۔ نہیں تھیں۔"

خادر نے کچھ سورج کر کہا۔ "میں تمہارا بہت مشکوڑ ہوں۔ میں چاہتا ہوں چھوٹا

کی طرح رونے لگوں۔ میں کہہ نہیں سکتا۔ میں کیسے عسوس کر رہا ہوں۔ آج سے تم  
میرے سکر ڈری ہو۔ خدا گواہ ہے۔ میں تمہیں اس کا عوض دوں گا۔  
اسی شام کو خادر نے صحراٰئی کی لکھی ہوئی نظم مشاعرے میں پڑھی نظم کا  
مطلوب کچھ اس طرح تھا:-

خاموشیوں کے پردے میں چھپے ہوئے تم کون ہو؟  
جو موسمیتی کے دریا بہار ہے ہو۔

رات کی تاریخی نے چاند کو چھپا رکھا ہے۔

کوشیلوں کی کان نے ہیرے کو چھپا رکھا ہے۔ خوفناک سا گرنے موٹی کو چھپا رکھا ہے۔  
تم کو تمہارے راز نے چھپا رکھا ہے۔

خاموشیوں کے پردے میں چھپے ہوئے تم کون ہو؟  
جو موسمیتی کے دریا بہار ہے ہو۔

(۱۲)

و دون اسی طرح گزر گئے۔ صحراٰئی آتے۔ خادر کی چھیلوں کا جواب دیتے۔ ایک  
دو شعر لکھ لاتے۔ اور انہیں دے جاتے۔ خادر کے پاس ملاقایوں کا تابندھا  
رہتا۔ «پیام وطن» کے خاص فوٹو گرافرنے آگر ان کی کئی تصاویر لیں۔ اور کئی لوگ  
آئے۔ انہوں نے تعریف کے پیل باندھ دیتے۔

صحراٰئی چھپے سے پرے بیٹھے رہتے۔ اپنے اشعار کی تعریف ہوتے دیکھ کر  
انہیں دل ہی دل میں جو مستر ہوتی وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ کبھی کبھی جب کوئی  
آدمی ان کے اشعار کا مطلب غلط سمجھتا۔ تو وہ چاہتے کہ اٹھ کر حمل مطلب کہ

دیں۔ لیکن پھر وہ سوچ کر کہ میں صحرائی نہیں ہوں۔ صحرائی کا سکرٹری ہوں۔ چکے بیٹھے رہتے۔

لیکن ایک دن صحرائی بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ کہ کمرے میں اینہے داخل ہوئی اُسے دیکھتے ہی صحرائی کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے وہ ایک خواب دیکھنے لگے ہوں۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ ایک نیچے دیکھنے لگے۔ جیسے وہ بیوش ہو رہے ہوں۔

ایہنہ نے جلدی سے کہا۔ صحرائی صاحب کہاں ہیں؟“  
صحرائی نے اس آواز کو نیچلی سے نیچلی تھوں میں چھپاتے ہوئے کہا۔“ وہ باہر گئے ہیں۔“

ایہنہ جلدی سے واپس چل گئی۔ لیکن صحرائی کی دنیا پر لگتی۔

ایک دن وہاں اٹیشن پر بھی انہیں ایسا معلوم ہوا تھا۔ اور آج پھر وہاں ایک بار اُن کے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ کہ وہ اپنے آپ کو ظاہر کر دیں۔ امیر بن جائیں۔ اور پھر ایہنہ۔ ایہنہ

دھیرے دھیرے اُن کے دل میں یہ خیال آنساز بر دست ہونے لگا۔ کہ وہ پاگل سے ہونے لگے۔ شہر سے دُور دریا کے کنارے جا کر کھڑے ہو گئے۔ باہلوں میں غروب ہوتے ہوئے سورج کو دیکھنے لگے۔ لیکن دل کی آگ ختم نہیں ہوئی۔ رات کے وقت وہ واپس آئے۔ دیواری اب بھی قائم تھی۔ جیسے کسی نے اُن کو بہت سافنشہ پلا دیا ہو۔

میر حسن کے گھر میں ہی ایک کمرے میں وہ رہتے تھے۔ خاور کے ساتھ ہی وہ

کرہ تھا۔ واپس آئے تو اُس میں چلے گئے۔ دیا بھی نہیں جلا دیا۔ پنچکے سے بیٹھ رہے اُسی وقت انہوں نے مُنا کہ خادر کے کمرے میں کوفی باتیں کر رہا ہے۔ انہوں نے غور سے مُنا۔ وہ خادر اور امینہ تھے۔

خادر کہ رہے تھے۔ تو کیا سچ مجھ آپ مجھ سے مجنت کرتی ہیں؟ امینہ کہہ رہی تھی جس کسی نے بھی آپ کے اشعار پڑھے ہیں۔ وہی آپ سے مجنت کرتا ہے۔ آپ شاید جانتے نہیں ہیں۔ کہ لوگ آپ کو کس مجنت بھری لگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ کی وہ "رقاصہ" زبان زبان پڑھے۔ آپ کا پیام وطن ہوت ہونٹ پڑھے۔ ان چیزوں کو لکھنے والا اُدمی اگر آدمی نہ ہو کر ایک پتھر بھی ہوتا۔ تو دُنیا اُس کے پاؤں چومنتی اور..... امینہ اُس سے مجنت کرتی یہی تم کہنا چاہتی ہو۔ اچھا۔ وہ دیکھو۔ وہ بجلیاں چمک رہی ہیں۔

"جیسے جلتے ہوئے تیر حلپ رہے ہیں"

صحراٰئی نے مُنا تو سر پیٹ لیا۔ اُن کتنی اچھی شبیہ ہے اور یہ بے وقوف یہ بیو قوت خادر۔ پر ذات۔ اس نے دھوکا دیکر اس غریب کو پاگل بیار کعا ہے۔ ایک دن جب اُسے معلوم ہو گا کہ یہ غبی خادر صحراٰئی نہیں۔ اور یہ شعریت سے بالکل اُمیٰ ہے۔ تو ————— تو —————

عمرانی دیوانوں کی طرح۔ ادھر سے اُدھر ادھر سے ادھر جلنے لگے۔ غصے سے جلتے ہوئے انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔ اس نے مجھے تباہ کر دیا ہے صحراٰئی۔ کون صحراٰئی ہے۔ میں صحراٰئی ہوں۔ میں اسے نظیمیں لکھ کر دیتا ہوں۔ وہ



لیکن ان کی دن کی بیتابی کا مطلب رات کی تاریخی نے سمجھا۔

رات بے حد تاریک تھی۔ جیسے بیوہ کا مستقبل ہو۔

اور گھٹائیں اس طرح لکھ رہی تھیں۔ جیسے بیوہ پر مدد امداد۔ ماں بھرپرے کی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ اور صحافی ہاتھ میں ایک خبر پڑے خادر کے کرے کی طرف جا رہے تھے۔ اس وقت اگر کوئی انہیں دیکھتا تو اُسے خواب میں بھی یہ خیال نہ آتا کہ یہی اُدمی در قاصہ، اور "ابلشار" کا مصنعت ہے۔ اس وقت اُس کی آنکھیں اندر ہیرے میں ہیں جس خبر سے زیادہ چمک رہی تھیں۔ اور پاگل شراہوں کی طرح لکھ رہا تھا ہوئے وہ آگے پڑھ رہے تھے۔ ان کے دل میں غصے کا ایک طوفان موجزن تھا۔ انہیں خود پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

ہوا ہو ہو کر کے چل رہی تھی۔ مجھی کمبھی کوئی لکھڑی کھٹستے پند ہو جاتی تو صحافی سر سے لیکر پاؤں تک پسینہ میں نہا جاتے۔ قدم لرزنے لگتے۔ اور ہاتھ کا پینے لگتا ایک بار وہ واپس بھی آئے۔ لیکن پھر آگے بڑھے۔ ان کے ہونٹوں نے دھیمی صبوط آواز میں کہا۔ چور۔ ڈاکو۔ وہ کہہ باز۔

ایک بار زدر سے بھلی کی کڑکڑا ہٹ ہوئی۔ اور دو جلدی سے زمین پر عیش گئے جیسے کوئی حملہ کرنے لگا ہو۔ لیکن پھر اٹھے اور آگے بڑھے۔

اور ابھی وہ خادر کے کرے کے باہر ہنچے ہی تھے۔ کہ بھلی ایک بار پھر جسکی۔ خادر کے باہر ایک شیشہ لگا ہوا تھا۔ صحافی نے دیکھا۔ کہ ایک ذاتی خونخواران جو ذاتا سے زیادہ بد صورت ہے۔ اور جسے دیکھنے کو جو نہیں چاہتا۔ اس شیشہ میں لکھا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں خبر ہے۔ اور اُس کے بال بھرے ہوئے ہیں۔

اُسے دیکھو کر لیکا یا وہ خوفزدہ ہو گئے۔ اور آہستہ سے انہوں نے کہا۔ ”یہ  
یہ ہی کیا صحرائی ہے؟“ تب ان کے دل میں امینہ کی تصویر آئی۔ وہ بے ہوا  
جگہ میں پڑے ہوئے چرانغ کی لوگی طرح خوبصورت تھی۔  
اس کو صحرائی کو اپس میں کیا نسبت ہے۔

پر صورت، خونخوار، غریب،

اس کے لئے وہ جیسے انسانوں کی زندگی بے مزہ کر دوں؟  
اس کے لئے ایک ادمی کی شہرت، عزت، محبت، دولت سب کرتباہ کر دے!  
داہ صحرائی صاحب!

تم لا ہو رہیں کیوں آئے تھے پہنچ لگام کے جنگل کتنے رہماوٹے تھے۔ دہاں یہ  
کچھ بھی نہ تھا۔

تب پتہ نہیں کیا ہوا۔ انہوں نے خیخڑ پھینک دیا مُسکرائے۔ اور وہی  
دھیرے والپس چلے آئے۔

اپنے کمرہ میں آ کر انہوں نے کاغذات کا ایک پلنڈہ لکالا۔ ایک  
صاف کاغذ ایکراپنے اسی زنازہ و سنجھڑ سے اس پر لکھا۔

”خادر!

میں جارہا ہوں یہاں رہنا ممکن نہیں رہا۔ لیکن تین سو کے قریب تھیں  
غزلیں، مسدس اور گیت چھوڑے جارہا ہوں۔ انہیں پہنے نام سے صحرائی کے نام  
ہے شائع کر دینا۔ ان کے بعد اگر تم کچھ بھی نہ لکھوگے۔ تو بھی کوئی تھیں آنکھ اٹھا کر دیکھ  
دیکھ ن سکیں گا۔ یہ پلنڈہ میری تمام عمر کا اٹھا شہے یہ میں تھیں پر وہ کہتا ہوں فقط داتما را سکتے ہیں،

اور اس خط کو اس بندل کے ساتھ ایک پرٹے میں باندھ کر اور اس کے اُپر جملی عروض میں یہ دنیا کے محبوب ترین صحراٹی کی خدمت میں لکھ کر اس نے وہ پلنڈہ خادر کے دروازہ پر جا کر رکھ دیا۔ اور خود اپنا دہ بوسیدہ سائبسترانٹا کر ڈپٹی مکشنر صاحب کے بنگلہ سے باہر چل دیا۔ اس وقت اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لیکن انہیں کرنٹ سے پوچھ کر وہ جلدی سے ایک طرف کو چلا گیا۔

اور اس کے بعد آج تک کبھی کسی نے اس کو نہیں دیکھا۔

### پھر ————— صحراٹی

ڈپٹی مکشنر امیر حسن کو بھولوں سے اس طرح پیار تھا جس طرح بخوبی کھلوں سے ہوتا ہے۔ انکی اس محبت میں شعیریت نہ تھی۔ پدرانہ شفقت تھی۔ صحیح ہی صبح اپنے باغ میں آجانا ان کا ایک معمول بن گیا تھا۔ اس روز بھی وہ آئے محمد و مالی نے دوڑ کر سلام کیا۔ ڈپٹی صاحب گلاب کے پے ترتیب پوٹے کو دیکھتے ہوئے بولے:-

تم نہایت سُست آدمی ہو۔ محمدو! دیکھو۔ اس کی ڈالیاں کس بے تربی سے بڑھ رہی ہیں۔ وہ دوسرا آدمی کہاں ہے۔ وہ چراغ؟ محمد نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ سر کار! وہ چراغ کوئی آدمی تو نہیں ہے وہ تو ساڑھے۔ اس سے کام نہیں ہو سکتا۔

ڈپٹی صاحب نے سہ سر کہا شاہزادی نہیں ہوتے؟ محمد نے سکرا کر کہا نہیں جی۔

ڈپٹی صاحب نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ اچھا یہ ڈالیاں ٹھیک کرنا۔ اور

چراغ سے کام لینا۔ اگر وہ کام نہ کرے تو کسی اور کو رکھ لینا۔

مگر چراغ پسلے ہی کام کر رہا تھا۔ محمد و بھی چُپ چاپ لگ گیا۔ دونوں گلاب کی ڈالیوں کو درست کرنے لگے۔

صحیح ایک حسین رقصاء کی طرح مشرقی دروازے سے دُنیا کے تھیڈیٹریں خل ہو رہی تھیں۔ اُس کی رقصاء انگلیوں نے متوجیتے تاروں کو خدا جانے کہاں کر دیا تھا۔ باغ میں یوکلپٹن اُپنے اُپنے اشجار کی چوبیاں اس کی فُرّانی انگلیوں کو چُپ مرہی تھیں سا اور بھپولوں کے ہنڈوں پر بیٹھے ہوئے نہیں نہیں شینمی قطرے منورہ ہو رہے تھے۔

اسی وقت ایک بیٹھی کوئی سی آواز سُنا تھی دی۔ وہ ایک گیت کی آواز تھی۔ جو بھولوں کو بلاتی شیعتم کو گدگداتی۔ باو صبا کو ایک نغمہ بتاتی۔ ان کے کافروں تک آ رہی تھی۔ چراغ نے اس گیت کو سنتا تو کام چھپوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

گیت کا مطلب سیدھی سادھی اُردو میں کچھ اس طرح تھا۔  
خاموش ہو گئے ہیں نغمے۔

ترفہ ماضی کی کہانی بن کر رہ گیا ہے۔

حسن پُر غور نے سازِ عشق کے ہنگڑے ہنگڑے کر دیئے ہیں۔

چراغ چُپ کھڑا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔ یہاں ایک اُس کی آنکھوں سے بے اختیا آنسو بہنے لگے۔

محمد نے اُسے دیکھا تو حیران ہو کر کہا۔ ”کیوں؟“

چراغ نے جلدی سے آنکھیں پوچھ دالیں اور کہا۔ ”کچھ نہیں یوں تھی۔ پتہ

نہیں آنکھوں میں کیا پڑ گیا تھا۔ یہ گیت کیا دُپٹی صاحب کی بیٹی امینہ گوارہ ہی ہے؟“  
محمد نے کہا۔ ہاں گا تو دہی رہی۔ لیکن کتنا پھر سا گیت ہے۔ شرمیں سکتے  
ہی لفٹنگے۔ پچے بیٹھ دے اور مجھے مانس بھی اس کو گاتے پھرتے ہیں۔ امینہ کے گھر  
والے ہیں نا۔ جانے کیا نام ہے ان کا۔ کوئی ان کو خاور صاحب کر کے مبتلا تا ہے  
کوئی صحرائی صاحب کر کے مبتلا تا ہے پچھلے سال جب تم ابھی لا ہو رہیں نہیں آتے  
تھے۔ وہ صحرائی کا نام رکھ کر کشیر ہیں چلے گئے۔ دہاں سے صحرائی کے نام سے نجیں  
اور گھلیں لختے رہے۔ وہ اتنی مشہور ہوئیں۔ کہ انہیں یہاں آنا پڑا۔ تب لوگوں  
کو پتہ لگا۔ کہ صحرائی تو دراصل خاور صاحب ہیں۔ بہت شور مچا۔ خوب جلسے ہوتے  
ڈپٹی صاحب خاور صاحب کو گھر لے آئے۔ یہاں آنے کے پچھے دیر بعد چھوٹی سر کا  
بے خاور صاحب کی شادی ہو گئی۔ انہی کا بنا یا یہ گیت ہے۔ سمجھے؟ اسے کہتے  
ہیں اور کیفیت اور اسے کہتے ہیں عقل تیجی تو دُپٹی صاحب کہتے ہیں۔ محمد و معاشر ہو گیا۔  
چراغ نے اس کی یہ لمبی تقریر نہیں سُخنی۔ وہ پھر اسی گیت کو سننے لگا۔ اور پھر ان  
کی آنکھوں سے آنسو بینے لگے۔

(۴)

لیکن محمد و چراغ کو کبھی بھی سمجھ نہ سکا۔ وہ عجیب قسم کا آدمی تھا۔ جب سے نوکر  
ہوا تصور یہ غم بیارہا۔ عقیل تھا۔ پر لے درجے کا ذہین تھا کمال تھا۔ لیکن معلوم نہیں  
اُسے کیا غم تھا۔ چرا مدرہ ہی اندر اُسے کھنڈا رکھنے دیتا تھا۔

اور ایک اُس کا بھائی تھا۔ پچھلیں پاگل سا۔ صورت میں چراغ سے زیادہ تاریک  
سیرت میں اُس سے دو چند دلوانہ۔ لیکن رہتا تھا خوش۔ چراغ کو دیکھ کر سہلتا تھا۔

اس کے غم کو دیکھ کر کہتا تھا۔ تم کو کس کا غم ہے؟“

چراغ کہتا تھا۔ دنیا کی ناشناستی کا۔ جواشرافت بیس دہ دھکے کھار ہے ہیں۔ جو رذیل ہیں۔ وہ عزت پار ہے ہیں۔ خاک اُن کے سر کو چاٹتی ہے۔ اور شہر اُن کے پاؤں میں لوٹتی ہے۔ تم دیکھو۔ شہر کا بچہ پچھے صحرائی کی نظیں گاہ ہے۔ اس کی عزت اور عقل کے راگ الاب پر ہے۔ اور تم۔۔۔ تم صحرائی یہاں کھڑے ہو۔ کسی کوتپہ بھی نہیں۔ وہ خادر کو صحرائی سمجھ رہے ہیں۔ ایک غبی کی عزت ہو رہی ہے۔ اور ایک شاعر مارے امارا پھر رہا ہے۔ صحرائی نے چراغ کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر جلدی سے کہا۔ خاموش کرنی سن لے گا۔ تو بُرا ہو گا۔۔۔

”لیکن چراغ نے جوش سے کہا۔ خاموش! خاموش۔۔۔ ہر وقت خاموش رہوں۔ آنکھوں کے سامنے خلم ہونا دیکھوں۔ اور خاموش رہوں۔ خدا کے لئے ایک بار جانے دو۔ اس خادر کی مشی پلید کر کے نہ رکھ دوں۔ تو مجھے چراغ نہ کہنا۔ ہم غریب ہیں تو کیا ہوا۔ خدا نے زبان تو دی ہے۔

صحرائی نے آہستہ سے کہا۔ جوش میں مت آڈ میرے بھائی۔ آہستہ سے بات کرو۔ خادر کا کیا قصور ہے۔ خدا کی مرضی ہی ایسی ہے۔ قدرت نے یو نہیں لکھ دیا ہے تو پھر تم یہاں آئے کس لئے لختے کس لشکھے نالی بنائے کر رکھایا تھا۔ میں تمہاری کسی بھی بات کو سمجھ نہیں سکتا ہوں۔

صحرائی نے دھیرے سے کہا۔ چلو جانے دو۔ میں بے دوقوف سی۔ تم میرے بڑے بھائی ہو۔ میری مدد کرنا تمہارا فرض ہے۔ اور دل ہی دل میں صحرائی نے کہا۔ تم کیا سمجھو گے بھائی! اکہ محبت کی خاطر انسان کیا کچھ کر سکتا ہے۔ تمہیں یہاں صرف اس

لئے فوکر کرایا۔ کہ کبھی کبھی امینہ کی آدازُ سن سکوں کبھی کبھی اس کا ذکر ہی ان پر نصیب کا ذکر کرنے والے ہو جائے۔

(۳۴)

خادر عرف صحافی کی ملک بھر میں دھوم مج رہی تھی۔ اس کے نام کا دنکا بجاتا تھا۔ اس کے اشعار سنند۔ اس کی زبان مکمال اور اس کے خیالات لاثانی سمجھے جاتے تھے۔ خادر تھا اور عزت تھی۔ اور شہرت تھی۔ خادر تھا اور دولت تھی خادر تھا و محبت در جمیت تھی۔ لکھنے ہی ہفتواں سے خادر نے ایک نیا شعر نہیں لکھا تھا۔ لیکن دو گوں کو یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا۔ کہ اس کے اشعار پڑانے پہنچتے اور بار بار پڑھتے تھے اور ہر بار اس طرح جس طرح وہ ابھی ابھی اس پڑا سردار شاعر کی زبان سے نیکلے ہوں۔ ہر بارہ آن میں نئے معنی پہنچ سلتے تھے۔ ہر بار نئے خوبیتیں وستیاں ہوتے تھے۔

اور امینہ تھی کہ اپنے محبوب کی اس شہرت سے پاگل ہوئی جاتی تھی۔ اُسے اب خادر سے زیادہ خادر کے اشعار سے مجتنم تھی داس طرح کے اشعار لکھنے والے سے کبھی نفرت بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا خیال بھی اس کے لئے محال تھا۔ وہ اس سے مجتنم نہیں کرتی تھی۔ اس کی پرستش کرتی تھی۔

---

انجمن ترقی نسوان کا ایک جلسہ ہوا تھا جو روتوں کو مجلسی، سیاسی، فرمہ بی اور ادبی مسائل کے متعلق زیادہ سے زیادہ واقعیت بھم پہنچانا اور ان مسائل کے بحث طلب اور پر مناظرے میں متفقہ کرنا انجمن کا کام تھا۔ آج کے اجلاس کا تعلق ادپسے تھا مضمون

تحا۔ صحراٹی کی شاعری یا میوں بھی اپنے ادبی سبکیستی کی صدر تھیں یہیں آج کے لئے  
خاص طور پر ان ہی کو کرسی صدارت پیش کی گئی۔

کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے صحراٹی کی زندگی کے متصل جو کسی کو معصوم تھا۔ اُس  
نے بتایا اور جو کچھ بتایا گیا۔ اُس میں سے ہے فیصلہ دی غلط تھا۔

پھر صحراٹی کی شاعری پر تنقیدیں شروع ہوئیں۔ تعریف و ثنا کے پل باندھ دیئے  
گئے۔ تعریفی الفاظ کا ایک دریا بہاویا گیا۔ کسی نے شیکھ پیش سے اس کا مقابلہ کیا۔ کسی  
نے ملٹن سے کسی نے مولانا روم سے کسی نے سعدی سے۔ کسی نے کالمیڈ اس سے اور  
کسی نے گیٹھ سے۔

صحراٹی کی تعریف ایک شراب تھی۔ جسے پل پی کر اپنے بہوش ہو رہی تھی۔  
لیکن یہاں ایک جیسے کوئی کسی کو نہیں سے جگا دیتا ہے۔ ایسا چونکہ پڑی۔ ایک حرث  
کہہ رہی تھی:-

”صحراٹی کی خلقت کو میں قسم کہتی ہوں۔ اُس نے کچھ اچھی چیزیں لکھی ہیں۔ ضرور  
لیکن اتنے ہی سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ وہ صاحب دیوانِ شعر کی صفت میں کھڑا ہو  
سکتا ہے۔“ کچھے دو ماہ سے صحراٹی نے ایک بھی نئی چیز نہیں لکھی۔ اس سے پہلے بھی اس  
کی جنظمیں، غزلیں اور گیت شائع ہوئے ہیں۔ وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے  
موجودہ زمانہ میں رہ کر رہیں۔ بلکہ کسی حنگل میں بیٹھ کر لکھے گئے ہوں۔ مجھے صدر محترمہ  
معاف فرمائیں۔ اگر میں کہوں کہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزلیں، نظمیں اور گیت  
کشمیر میں ہی لکھے گئے تھے۔ اور وہاں سے آنے کے بعد خادر عرف صحراٹی نے کوئی نئی  
چیز نہیں لکھی۔ میں نے نہایت غور سے صحراٹی کی چیزوں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ چیزوں

اس قابل ہیں۔ کہ ہم ان کی پرستش کریں یا نہیں ۔

وہ ایک موٹی سی عورت تھی۔ اُس کی آواز بیڑا اور صفات۔

اینہ غصہ سے جال رہی تھی۔ مگر موٹی عورت نے کہا۔

یہیں ان کی چیزوں کا مطالعہ کرنے کے بعد میں دو تجویں پہنچی ہوں۔ اول تو یہ کہ خادر عرف صحرا فی نے یہ چیزیں ایک ہی بار ایک خاص جذبے کے ماتحت لکھی تھیں۔ اور اب یہ کوشش کر کے بھی وہ دیسی چیز تو کیا اس کے پایہ کے ہزاروں حصہ کی چیز بھی لکھنے کے قابل نہیں ہے۔

اینہ نے میر کے نیچے رُدمال کو دنوں ہاتھوں سے اس طور سے کھینچا۔ کہ وہ پھٹ کیا۔ یہیں وہ جلدی ہی سنبھال کر تقریبی سنتے لگی۔ وہ موٹی عورت کہ رہی تھی۔

— یا اگر یہ بات نادرست ہے تو — تو مجھے معاف فرمائیں۔ تمام ہنیں اور خاص طور پر صدرہ محترمہ — مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خادر عرف صحرا فی کوئی اور تھا۔ خادر نے اُس کا سوانگ بھرا ہے۔ اُس کی چیزیں چڑا کر لوگوں کو دھوکا دیا ہے —

اینہ کے ساتھ ہی ساتھ بیٹھی ہوئی جسے کی تمام مستویات بیک وقت اٹھ کر لکھی ہو گئیں۔ کوئی بھی اس بات کو سنتے کے لئے تیار نہ تھی۔ سب طرف سے ایک شور سائٹا یہ اپنے الفاظ کو واپس لو۔ اپنے الفاظ کو واپس لو۔ یہ اس انہیں کی ہتا ہے۔ اس موٹی عورت نے گھبرا کر کہا۔ یہیں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ سب عورتیں بیٹھ گئیں۔ موٹی عورت نے پھر جو شے کے ساتھ کہا۔ یہیں میں اب بھی

اس بات کو دوہرائی ہوں۔ کہ خاور عوف صحرائی نے یہ تمام چیزیں ایک جوش میں ایک دلوے میں آگر لکھی تھیں۔ اب وہ کوشش کر کے بھی ویسی چیزیں نہیں لکھ سکتے۔“  
ایمنہ غصہ سے بھری ملٹھی تھی۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ حمدارت کے قریبے کو بھول اور ادب کے قریبے کو بھول کر اس نے کہا۔ ”اپ مجھے معاف کریں۔ آپ جو کچھ فرمادی ہیں۔ از سرتا پا غلط ہے۔ خاور اب بھی ویسی ہی چیزیں لکھ سکتے ہیں۔ جیسی انہوں نے پہلے لکھی تھیں۔ میں چیلنج کرتی ہوں۔ کوئی آئے اور دیکھو۔“

اس موٹی عورت نے اس بارگمبل سے کہا۔ ”میں تیار ہوں۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو اس غلطی کو تسلیم کرنے میں مجھ سے زیادہ کوئی خوش نہ ہو گا۔“  
ایمنہ نے جوش کے ساتھ کہا۔ آج شام کو صحرائی اپنی ایک آج کی لکھی ہوئی چیزیں کریں گے۔ اور میں وعدہ کرتی ہوں۔ کہ اسے منہنے کی خوش نصیبی سب سے پہلے نہیں ترقی نہواں کی اولی سب کیمیٹی کی ارائیں کو ہو گی۔ اور میری یہ ہبھیں اس محفل میں مدعو کی چاہیں گی۔ اس موٹی عورت کے اور سب نے چیزوں دیئے۔ اور پھر جلدہ محل کے لئے ملتزی کر دیا گیا۔

(۳۶)

خاور پر کئے گئے اس جملے کی خبر نہیں ترقی نہواں تک ہی محدود تھی۔ لب پہ کان لب بکان یہ چتر شہر کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی۔ اور وہ ٹھنک کر رہ گئے۔  
جس بات کا انہیں سدا سے خدشہ تھا۔ وہی سامنے آگئی۔ سانس تیزی سے چلنے لگا۔ پیٹھائی کی نتیں چھوپ آئیں۔ اور دل دھک دھک کرنے لگا۔ خاور نے کھپڑ کر ایک خاموش آواز میں کہا۔ ”اب کیا ہو گا۔“ وہ پرجننت صحرائی پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے۔

اگر وہ لوگ نظم لکھنے کو کہیں گے۔ تو کیا کروں گا۔ پورا فی تمام چیزیں جو وہ چھوڑ گیا تھا ختم ہو گئی ہیں۔ تو اب۔ اتنی غلت۔ اتنی شہرت کے بعد یہ حشر۔ خادر ماتھا پکڑ کر بیٹھ گئے۔

اس وفعہ انہوں نے سنا۔ اینہے اور ڈپٹی صاحب باتیں کرتے ہوئے اندر آئ رہے ہیں۔ اینہے کی آواز سے رتاو لاپن اور گھبراہٹ سی عیاں ہتھی۔ ڈپٹی صاحب اُسے تحمل سے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

بیٹھی صبر سے کام لو۔ ادب کی خدمت کرنے والوں کی راہ میں نکتہ چین خارپن کر بچھد جاتے ہیں۔ لیکن اس سے گھرا نہیں چاہیئے۔

اور بیٹھی کہہ رہی ہتھی۔ اباجی میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ بے عذت برداشت نہیں کر سکتی۔ میں مزا قبول کر سکتی ہوں۔ لیکن لوگوں کی آنکھیں نیچی ہو کر نہیں رہ سکتی۔ تم تو لگلی ہو رہی اینہا۔ تریاہٹ پسے سنا تھا۔ آج دیکھ رہا ہوں۔ اینہے نے کہا۔ لیکن آباجی! مجھے یقین ہے کہ خادر ہی صحرا فی ہے۔ وہ اب بھی پسے جیسی چیز لکھ سکیں گے۔ اور میں ان سب کامنہ توڑنے کے قابل ہو سکوں گی۔ اس پر وہ دنو خادر کے پاس آپنچے۔ خادر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور انہیں دیکھ کر چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرنے لگے۔

ڈپٹی صاحب خادر کی شکل دیکھتے ہی سب کچھ سمجھو گئے۔ ان کے دل کو ایک دھکا لگا۔ اور تب وہ پہت جلدی سے باہر چلے گئے۔

اس کے بعد اینہے بھی بست دیر داں نہیں ٹھیری۔ لیکن حقیقی دیر ده داں ہی اتنی دیر میں اُس نے کچھ کا ذم کان کہہ دیا۔ خادر خوف سے کاپنے لگے۔

(۵)

آفتاب مغرب کی خاموشیوں میں ڈوبا جا رہا تھا۔ شامِ مشرق کی چرکھت پر آکھڑی ہوئی تھی۔ اور ایک روشن تاریکی نے آسمان پر سلطنت جہانے کی کوشش کی۔ محمد و مالی چھپوں کے تین گلدوں سے بنایا کر لایا۔ ایک ڈپٹی صاحب کے کمرے میں کو دیا۔ اور ایک امینہ کے کمرے میں۔۔۔ لیکن جب وہ خاور کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ کمرے میں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ سامنے ایک خالی کاغذ ہے۔ ما تھیں قلم ہے۔ بلکہ میں آگ ہے۔

آن کی صورت دیکھ کر وہ خوفزدہ سا ہو گیا۔ اور جلدی سے گلدوں سے سجا کر وہ باہر چلا آیا۔ لیکن پرستی سے اس باہر والے کمرے میں ٹیلیفون پڑا تھا۔ جو نبی محمد و اس کمرے میں آیا۔ تیونہی ٹیلیفون کی گھنٹی ڈرے زور سے نجح اُٹھی۔ محمد نے چونکا اُٹھایا۔ اور کہا۔ جی ہجور۔۔۔ ہاں۔ ڈپٹی صاحب کے پنگلے سے سرکار اس وقت۔۔۔ ہاں نہیں تھیں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ تھیں۔۔۔ کیا کہوں۔۔۔ میں نہیں تھیں۔۔۔ بے انج من۔۔۔ تر کھٹے۔۔۔ ادب۔۔۔ کے سیکرٹری۔۔۔ بہت اچھا۔۔۔ آپ اور صاحب صدر۔۔۔ یہاں تشریف لائیں گے۔۔۔ ؟ بہت اچھا۔۔۔ یہی کہہ دوں گا۔۔۔ کہہ دوں گا۔۔۔ کسی اور جا پہ جائیں نہیں۔۔۔ بندگی ہجور۔۔۔

اور تب ایک بار بھروسے خادر کے کمرے میں چانا پڑا۔ در دائرے میں ہی لکھا ہو کر اُس نے کہا۔۔۔ ہجور۔۔۔ انج من تر کئے ادب کے سیکرٹری اور صدر صاحب کرتے ہیں۔ وہ ہجور کے پاس آج رات کے ہنچے تشریف لائیں گے۔ آپ کہیں جائیے۔

نہیں۔

خادر خاموش رہے چُپ چاپ اس طرف تکتے رہے محمد پیغام دے کر جلدی سے باہر گیا۔

(۶۴)

محمد نے چراغ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ معاوم نہیں آج یہاں کیا ہے۔ جو اتنے آدمی دھکڑ دھکڑ چلے آ رہے ہیں۔ وہ دیکھو۔ سوانیاں بھی کتنی ہی نہیں۔ میں تم سے کہوں چراغ۔ چودھویں صدی کا پرہ دیکھنا ہوتا دھر دیکھو۔ دو ایک کو چھوڑ کر کسی نے بر قع نہیں اور وہ رکھ۔

چراغ نے کہا۔ لیکن یہ ہے کیا؟ کیوں یہ لوگ یہاں اس وقت گم جمع ہو رہے ہیں۔ لیکن چراغ کو بہت دیر تک اندر چھیرے ہیں نہیں رہنا پڑا۔ اصلی بات سُنتے ہی اس کی آنکھوں سے مرست یوں عیاں ہونے لگی۔ کہ چھپائے ہی نہ چھپتی تھی۔ کہ اسے بہت اقیسہم کی پادشاہ بہت مل گئی ہے۔ اور اپنے کام کو وہ اتنی جلدی کر رہا تھا۔ کہ محمد نے جیران ہو کر کہا۔ تمہیں آج کیا ہو گیا ہے چراغ؟

(۶۵)

چراغ کو جو کچھ ہو گیا تھا۔ وہ اس نے محمد کو نہیں بتایا۔ لیکن کام سے فراغت پاتے ہی۔ اور تب رات نے دنیا پر تاریکی کی بارش کر دی۔ وہ اپنے چھوٹے سے جھونپڑے میں گیا اور پولا۔ "صحرا فی"

صحرا فی دیوٹ کی روشنی میں بیٹھا کچھ نکھر رہا تھا۔ لکھتے لکھتے اس نے کہا۔ "تمہیں سو بار کہا ہے بھیا۔ مجھے اس نام سے مت پُکارا کرو۔"

لیکن چراغ نے جیسے اُس کی بات سُنی ہی نہ ہو۔ پاس جا کر بولا۔ "کمال ہو گیا ہے۔ وہ خدا نے غفور رحیم دکریم بھی اور جبار و قہار بھی۔ کمال ہو گیا ہے۔"

صحرا فی نے قلم کو علیحدہ رکھ کر کہا۔ "تم اور اتنے خوش بتاؤ کیا ہوا ہے۔۔۔؟"

چراغ نے کہا۔ "تم خوشی سے پھوٹے نہیں سماوٹے گے۔ پاگل ہو جاؤ گے۔"

صحرا فی۔۔۔ تم کچھ کہو گے بھی بجا تھی۔ کہ پیلیاں ہی ڈالتے جاؤ گے۔

چراغ نے ہنستے ہنستے کہا۔ "تم شہر میں نہیں گئے، کچھ سنا نہیں۔"

صحرا فی نے تنگ آکر کہا۔ گیا تھا۔ سنا ہے۔ صحرا فی مر گیا۔

چراغ نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "مرا نہیں۔ مر نے والا ہے۔ جسمانی طور پر نہیں اخلاقی طور پر۔ لیکن۔۔۔ یہ صحرا فی نہیں جو جھونپڑے میں رہتا ہے۔ وہ صحرا فی جو ٹرپی صاحب کے بیٹھلے میں رہتا ہے۔ جو اپنہ کا گھر والا ہے۔"

صحرا فی تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو بجا تھی۔ صاف صاف کہو۔"

چراغ نے اپنے گرانڈیل حبیم کو چار پانی پر گراتے ہوئے کہا۔ "بس بجا تھا۔ اچھوٹ گیا۔ کچھ لوگوں کو شک ہوا۔ کہ خاور صحرا فی نہیں ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا تھا۔ کہ آج شام تک خادر میاں ایک نہیں نظم کر کر سنا ہیں۔ اس سے پتہ لگ سکے جا۔ کہ خاور ہی صحرا فی ہیں یا نہیں۔ اور رات ہونے کو آئی ہے۔ خادر ایک مصروع بھی نہیں لکھ سکا۔ بھٹ کاٹھٹ دوگ انتظار کر رہے ہیں۔ اور خادر ایک لاش کی طرح خاموش ہے۔"

صحرا فی نے سنا تو خیال میں ڈوب گیا۔ اس طرح خاموش جیسے آدمی رات اور اس طرح غمناک جیسے تیہم خانہ کی رپورٹ۔

چراغ نے امید کی تھی۔ کہ اس خبر سے وہ خوش ہو گا۔ اب اُسے غمناک ہوتے

ویکھا۔ تو جیران ہو کر پڑھچا۔ کیوں کیا ہوا؟

صحراٰی نے دھیمی آداز میں دھیرے ہے کہا۔ بہت بُرا ہذا ہے بھائی!

چراغ نے جوش سے کہا۔ بُرا کیا ہوا ہے جو سزا دار ہے اُسے سزا مل رہی ہے۔ بُرا کیا ہے؟ خوشی کی بات ہے۔

صحراٰی نے دھیرے سے کہا۔ سزا دجزا کا مالک تو وہ پروردگار ہے۔ بندہ کا کیا ہے سے ہر ایک انسان کی مدد کرنی چاہئے؟

چراغ نے تڑپ کر کہا۔ چور کی بھی؟

صحراٰی نے دھیرے سے کہا۔ ہاں۔ اگر وہ اسے چوری سے باز نہ رکھ سکتا ہو تو لیکن بھیا باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں ابھی کچھ نظریں اور گیت تھیں دیتا ہوں۔ تم جا کر خادر کو دے آؤ۔ اس کی عزت نجح جائے گی۔

چراغ کے پاؤں تکے جیسے دھکتا انگارا ہگیا ہو۔ اُس نے اچھل کر کہا۔ تم کیا بک ہے ہو۔ میں نہیں کر دیں گا۔ صحراٰی نے نرمی سے کہا۔ تم میرے بھائی نہیں ہو؟ تم میری بات نہیں ہان سکتے؟

چراغ کی آنکھوں میں آنسو بھرا ہے۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ میں نے کبھی تھیں انگار کیا ہے۔ تم عقلمند ہو۔ شاعر ہو۔ میں بیوقوف کسان ہوں۔ تمہارے دل میں جو خیالات اور جذبات ہیں۔ وہ مجھ میں نہیں ہیں۔ میں کبھی بھی مجھ نہیں سکا ہوں۔ نہ تم کونہ تمہاری شاعری کو۔ تم انسان نہیں ہو۔

نہیں۔ بھیا! صحراٰی نے جلدی سے کہا۔ میں انسان ہی ہوں۔ اپنا سے محبت ہے۔ اسے میں قلبیت میں دیکھنا نہیں چاہتا ہوں۔ شاگر خادر کا بھید بھپوٹ گیا۔ تو اونہ

کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اس خود غرضی کے لئے میں خادر کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔  
چراغ نے بیٹھے ہوئے آپال کی سی آواز میں کہا۔ جو تمہاری مرضی ہے۔ صحرائی!“  
تلخے کے ایک میٹے سے پورا نے غلاف میں کاغذ دل کے بہت سے ٹکڑے  
کو درسے کر کٹ کی طرح بھرے ہوئے تھے۔ صحرائی نے غلاف میں سے مٹھی بھر کر کچھ ٹکڑے  
نکالے۔ اور ان میں سے فراؤ ایک ایک کر کے دیکھنے لگا۔ ان میں سے ایک گیت  
کو دیکھ کر وہ یہ کاپک رُک گیا۔ اور پھر پولا۔ ویکھو بھائی! اکتنا اچھا گیت مل گیا ہے۔ وقت  
کے لئے کتنا موز دل ہے۔

چراغ نے لے کر پڑھا۔ اس کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

”میرے مولا! وہ ایک اور گیت سنانے کو کہہ رہے ہیں۔

تم جانتے ہو کہ میں ایک بھی گیت نہیں گا سکتا۔ تم بھی جب چاہتے  
ہو۔ اس ساز سے قمعے پیدا کرتے ہو۔ تم جب چاہتے ہو۔ قیامت اٹھاتے ہو۔ اور  
بٹھادیتے ہو۔ لیکن — میں؟“

تمہاری بھی یہی خواہش ہے۔ میرے مالک! تو.....

وھیرے وھیرے آبشاروں کا گیت اٹھاو۔

ترنگوں کے زخم کوے کروہ آسمان کے ستاروں تک پہنچے۔

جگاں اٹھیں سوتے ہوئے پھول۔

اور شینم رقص کرنے لگے۔

بھول بیا میں خوشیاں۔

ادغام کے دریا جسے لگیں۔

میرے مولا — ! میرے ماں — ! —

چراغ نے پڑھ کر اگست اچھا ہے۔ موزوں بھی معلوم ہوتا ہے۔ چلو اب چلیں۔  
صحرا فی نے کہا۔ ایک منٹ پھر وہ کچھ اور اچھی چیزیں بھی ساختہ بھیج دیں۔ تو  
اچھا ہو گا۔ اور پھر اسی غلاف میں سے اور کوڑا کر کت نکال نکال کر دیکھنے لگا۔  
اس وقت چراغ نے جھوپٹی سے باہر جھانک کر کہا۔ اب تمہارا تردد فضول  
معلوم ہوتا ہے۔

صحرا فی۔ "یکیوں؟"

چراغ۔ میرے خیال میں ۹ سے اُپر کا وقت ہو گیا ہے۔ اور جو ہونا تھا۔ ہو چکا ہو گا۔  
صحرا فی نے جلدی بہت کافی جیبوں میں بٹھنے ہوئے کہا۔ — تب تو  
جلدی چلو۔ — اور قبودہ دونوں دہائی سے باہر نکل پڑے۔

(۹۱)

رات خاموش تھی اور تاریک جس بانگ میں سے ہو کر دہ دنوں جا رہے تھے! اس  
میں چپ چاپ برس رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کبھی بھی یہاں کوئی نہیں آیا۔  
چراغ نے جیران ہو کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ سب لوگ چلے گئے۔  
صحرا فی کے سر پر جیسے کسی نے تلوار مار دی ہو۔ جھٹتا اٹھا۔ اور گلبہر ای آواز نہیں کہا۔  
"تمہارا مطلب ہے کہ —

چراغ نے سنجیدگی سے کہا۔ میرا مطلب ہے کہ ہم دیر سے پہنچے ہیں۔ جانڈا اچھوٹ  
چکا۔ اب ہمارے بنائے سے بنے گا نہیں۔  
صحرا فی نے جلدی بے کہا۔ تو وہ لوگ یہاں سکتے ہیں۔

چراغ یہاں بھی تھے۔

صحرا فی ”تو شاید اندر ہوں۔ شاید اس نے کوئی چیز لکھ لی ہو۔ اور سنا رہا ہو۔“  
چراغ نے نہیں کہ کہا۔ قم تو ہو پاگل۔ خادر اور کچھ لکھ لے گا۔ خدا خدا کر د۔ اور وہ اُدمی  
اگر یہاں ہیں تو الجھی معلوم ہٹوا جاتا ہے۔ بیرے یعنی پچھے آ جاؤ۔“

پھر انہیں دو خاموش سائے چلتے گا۔

رات خوب تاریک تھی۔ اور آسمان میں تارے نکل آئے تھے۔ بڑے پوسٹافس  
کی گھری نے تھوڑی بھی دیر ہوئی تین ٹن کر کے ۹ بجاء میئے تھے۔ اور وہ دونوں مکان کے  
چاروں طرف گھوم رہتے تھے۔ آخر تھک کر چراغ نے کہا یہاں کوئی نظر نہیں آتا۔  
اسی وقت انہیں ایک بآواز سُنائی دی۔

یا حسیم! یا کریم! اے ذات پاک! اے پاک پروردگار تو سب کی شرمن ہے  
تو سب کا آسراب ہے۔

چراغ نے پہچانا۔ وہ دُشپی صاحب تھے عصر کی نہاد ادا کرنے بعد سجدے میں  
پڑے دعا مانگ رہے تھے۔ اے رب العالمین! اے رحمٰن! اے رحیم! اے یوم  
قیامت کے مالک! اے خبیث کرنے والے! اے کرم کرنے والے! اے شفقت  
کرنے والے! میری بیٹی کو بچاؤ۔ تم گواہ ہو۔ میں نے ہمیشہ اے جان سے غریز رکھا ہے  
لیکن آج اس کی آنکھوں میں خون ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ اے مالک دین و دُنیا!  
اس کے دل پر اس پاٹھی فرشتے نے قبضہ کر لیا ہے۔ وہ اپنے خادر سے نفرت کرنے  
لگی ہے۔ مجھے در ہے غصے میں وہ کچھ کرنے بیٹھے۔ راستے اے جیم! اے عنقر!  
اس سے صراطِ مستقیم پر لے آ۔ اے نیک بیوی کے سے چلن سکھا۔ اس کے دل کو امن

اوہ پھیں دے۔ وہ میری اکلوتی بیٹی ہے یا رب! وہ بے ماں کی بیٹی ہے۔ وہ قسم ہے۔ صحرا فی اور چراغ۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو بنتے لگے۔ تب صحرا فی نے جلدی سے چراغ کا ہاتھ پکڑ کر کھا۔ چلو بھیا۔ یہاں سے چلو۔ لیکن ابھی وہ تھوڑی وُدرہی لگتے تھے صحرا فی چلتے چلتے کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔ وہ دیکھو۔ وہ سامنے اس اور والی منزل میں کھڑکی میں کون ہے۔ چراغ نے غرہ سے دیکھا اور کھا۔ ارسے یہ تو خادر اور ایمنہ ہیں۔ لیکن انہیں کیا ہوا ہے۔ خادر و بکار سا کھڑا ہے۔ ایمنہ ایسے معلوم ہوتی ہے۔ جیسے ابھی جھپٹے گی اور خادر کو کھا جائے گی۔ صحرا فی نے کہا۔ چلو ذرا نزدیک چلیں۔ جہاں سے اُن کی آواز من سکیں۔

تب وہ دونوں کھڑکی کے نیچے دیوار سے تھوڑا پرے ہٹ کر کھڑے ہو گئے انہوں نے سنا۔ ایمنہ کہہ رہی ہے۔

”تو جو کچھ تم نے لکھا ہے۔ وہ ٹھیک ہے۔“

”دیکھی آواز میں خاوند نے کہا۔“ ہاں۔

ایمنہ نے کڑک کر کہا۔ ”تو تم صحرا فی نہیں ہو۔“

”نہیں۔“

”تو تم نے مجھے دھوکا دیا تھا۔“

”ہاں۔“

ایمنہ کو جیسے سانس پڑھ گیا ہو۔ وہ بولی نہیں۔ لیکن اُس کے ساف سینے کی آواز نیچے تک آتی رہی۔ تب دھیرے بے خادر آگے پڑھا۔ صحرا فی اور چراغ نے دیکھا کہ وہ ایمنہ کے بہت نزدیک پہنچ گیا ہے۔ ایمنہ نے حقارت سے اُس کی طرف دیکھا

ادبیت پر بھی ہے۔ اس کے اندر میں ایک کاغذ تھا اور وہ اس طرح کا نظر ہاتھ  
بیٹھے اس کے پیچے کوئی مشین لگی تھی۔ خادر کھنڈوں کے بل زین پر بیٹھ گیا۔ اس نے  
دو توں ہاتھ جوڑ لئے اور کہا:-

"ایمنہ"

ایمنہ بولی نہیں۔ چھپت کو تکتی رہی۔ اس نے خادر کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ بُھرے  
ہوئے گلے سے خادر نے پھر کہا۔

"ایمنہ میں معافی مانگتا ہوں"

ایمنہ تب بھی چھپت کی طرف دیکھتی رہی۔

خادر نے پھر کہا۔

"ایمنہ۔ میں معافی مانگتا ہوں۔ اور اگر قم معاف نہیں کر دی۔ تو میں مر جاؤں گا"۔  
ایمنہ نے چھپت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "ذلالت کی زندگی سے موت  
بہتر ہے"۔

خادر نے کہا۔ تو تمہاری یہی مرضی ہے۔ کہ میں مر جاؤں۔

ایمنہ چھپت کی طرف دیکھتی رہی۔

اسی وقت خادر نے جیب سے ایک چمکتا ہوا خنجر نکال لیا۔

صحرا فی نے چونک کر کہا۔ "یہ کیا؟"

پرانگ نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

خادر نے خنجر کو سینہ پر تان کر کہا۔ "ایمنہ میں مرتا ہوں۔"

ایمنہ تب بھی چھپت کی طرف تاکتی رہی۔

خادر نے کہا۔ اینا! خدار ایک بار ادھر دیکھو۔ تو کیا یہیں مر جاؤں؟

ایتنا پھر بھی خاموش۔

خادر نے کہا۔ اینا تم مجھے قتل کر رہی ہو۔

ایتنا نے چھٹ سے زگاہ نہیں ہٹائی۔

خادر نے پھر کہا۔ اینا! تم مجھے قتل کر رہی ہو۔

اینا نے پھر بھی نہیں دیکھا۔

تب بھلی کی سی تیزی کے ساتھ خادر نے وہ لمبا خنجر اپنے بینے ہیں گھونپ لیا۔

ایک در دن اپنے سب اطراف گوئیجھی۔ اور اینہے نے گھبر کر نیچے دیکھا۔ کہ خادر

سچ مجھ مرا پڑا ہے۔

گھبراہٹ یہیں جلدی سے خادر کے اوپر چکی۔ اور اس نے وہ خنجر کاں کر کھڑی

میں سے نیچے باغ میں پھینک دیا۔ جہاں چراغ اور صحراٰتی کھڑے تھے۔

اس وقت اس کمرے کے پچھے دروازے سے دو آدمی اندر آئے۔ وہ انہیں

ترقی ادب کے سیکرٹری اور صدر تھے جن کے آنے کی اطلاع چراغ نے شام کیوقت

خادر کو دیکھتی۔ انہوں نے آتے ہی دیکھا کہ خادر خون میں لٹ پٹ پڑا ہے۔ اینہے ایک

خون آلو خنجر کھڑکی سے نیچے پھینک رہی ہے۔ اور خادر آخری سافس لیتا ہوا کراہ رہا ہے

خوف دہراں نے انہیں کچھ بولنے نہیں دیا۔ وہ چُپ پاپ کھڑے رہتے۔ خادر نے ایک

پار کراہ کر کہا۔

”قاتل۔ قاتل اینا۔ قاتل۔

نیچے باغ میں صحراٰتی نے چکپے سے وہ خنجر اٹھا لیا۔ اور پاگلوں کی طرح چراغ تو

دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ —— یہ کیا ہوا؟“

چراغ نے بردستی و خلیل کرائے گھر کی طرف لے آیا۔ لیکن اُس نے دیکھا نہیں کہ دخون آلو و خبز بھی ساتھ رہی نہ ہے آرہا ہے۔

(۱۰)

مژون ایک نہایت درذراک لیجے میں علی الصباح کی اذان دے رہا تھا۔ اور ایک فیر صبح اٹھ کر کہہ رہا تھا۔

یا اللہ الا اللہ

یا اللہ الا اللہ

دُورِ مشرق کی گود میں نپچے کی مسکراہٹ کی طرح پوچھت رہی تھی — چراغ جلدی سے اپنے جھونپڑے میں آیا۔ صحرائی دیا جلا کر کچوں لکھ رہا تھا۔

چراغ رات بھر ڈپٹی صاحب کے مکان پر رہا تھا۔ ابھی ابھی داپس آ رہا تھا۔ وہ صحرائی کو لکھتا ہو اچھوڑ گیا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ آئے گا تو وہ سویا پڑا ہو گا۔ اب اُسے جاگتا دیکھا تو ذرا میش سے کہا۔

”کیا لکھ رہے ہو؟“

صحرائی نے کاغذ کو ایک طرف چھپاتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں۔“

چراغ نے غصہ کے ساتھ کہا۔ ”کچھ نہیں سے کام نہیں چلے گا۔ دکھا دیکھا رہے ہے۔“ تب اُس نے وہ کاغذ لیکر پڑھا۔ وہ ایک فنظم تھی۔ بہت ہی بگھوں پر تو اُسے پچھوچھی مطلب سمجھنہ نہیں آیا۔ جو کچھ اُس سے سمجھ آیا۔ جو کچھ بعد انہاں اُس نے لوگوں کو سُفنا یا۔

اُس کا مطلب کچھ اس طرح تھا:-

قبر کے صحابیں کاروان عالم نہ جانے کہاں کم ہو گیا ہے۔

مروت کی رات نے تاریخی کا پردہ ڈال رکھا ہے۔

میں ساغر دینا نئے کھڑا ہوں۔

ساقی۔ — ساقی کی آوازیں ستتا ہوں۔

لیکن یہ پتہ نہیں لگتا کہ کے پلاوں۔

کیا کر دوں

کہاں جاؤں۔

لیکن الجھی دہ اس نظم کو پڑھ ہی رہتا — کہ صحافی یک پونک پڑا۔ بولا

دہاں کا کیا بنا؟

پڑھنے والے سے کہا جو بناتھا — اپنے گرفتار کر لی گئی ہے۔ اسے کسی طرح  
کا بیان دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کے پاس سے خاور کا ایک خط ملا ہے۔ جس  
میں اُس نے لکھا تھا۔ کہ میں صحافی نہیں ہوں۔ انجمنِ ترقی ادب کے مکار ڈری اور صدر  
اس بات کے گواہ ہیں۔ کہ اپنے نے اُن کے سامنے ایک خبر خاور کے سینے سے نکال کر  
کھلکی میں پھینکا۔ اور کہ خاور نے مرتبے وقت اپنے اتم مجھے قتل کر رہی ہو۔ اور قاتل۔

ایتنا قاتل کہا۔ ان تمام شہادتوں کی موجودگی میں ڈپٹی صاحب نے بھی اُسے فحش  
پورہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ نے سے پھانسی ہو گی۔ یا کہست کم  
کالا پانی ہو گا۔ اور ہو گا اپنے باپ کے ہاتھ سے۔ یک نکہ ڈپٹی صاحب خود یقین کرتے ہیں  
کہ اُس نے قتل کیا ہے۔ اور انہیں کی عدالت میں آج اُسے پیش ہونا ہے۔ اور

میں کہتا ہوں —

راسی طرح دہ کئے جا رہا تھا۔ اور نہ جانے کب تک کہتا رہتا۔ اگر صحرائی یا کایک ہیوٹ  
ہو کر نہ گرفڑتا۔

(۱۱)

شر میں خوف دہ راس کی طغیانی سی آگئی تھی۔ لوگ سہم سہم کر رہا تھا کہ کسی  
کو بھی اس بات کی اُمید نہ تھی۔ لیکن کسی کو بھی خادر کے مرنے کا افسوس نہ تھا۔ اینہے سے  
خواہ مخواہ ہر ایک کو عقیدت سی ہو گئی تھی۔ راس کی محلبی مقبولیت پہلے بھی بہت تھی اب  
اُنہیں وہ ایک شہید معلوم ہونے لگی۔ لیکن اس کا کسی کو بھی شک نہیں تھا۔ کہ اینہے نے  
خاور کو قتل نہیں کیا۔

جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر شر میں گھوم رہی تھی۔

اور ٹھٹ کے ہٹٹ کے ہٹٹ لوگ کچھری کی طرف چلے جا رہے تھے۔ عدالت کا وقت  
ابھی نہیں ہوا تھا۔ ڈپٹی صاحب ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ لیکن کچھری میں وزیر  
ٹھٹھٹ بھرے ہوئے تھے۔ باہر بھی انسانوں کا سمندر رکھا تھیں مار رہا تھا۔ معائن ٹھٹ  
کر کے دس زخم گئے۔

اسی وقت سپاہیوں کے پہرے میں اینا کو لایا گیا۔ ایک ہی رات پیس اُس کا  
زندگ زرد ہو گیا تھا۔ اور وہ اس طرح چل رہی ہے قبر سے نکل کر آئی ہے۔ ایک بار بھی  
اُس نے آنکھوںٹھا کر اور پر نہیں دیکھا۔ لیکن جو ہر جو دھر سے وہ گزر قی گئی۔ لوگ خود بخود  
لاستہ بناتے گئے۔ کرنی بھی کچھ نہیں بولا۔

ایک خاموش سائے کی طرح وہ در دارزے میں داخل ہو گئی۔ اور چپ پاپ

ملزموں کے بیچ پر جا کر بیٹھ گئی۔

لوگ ٹکٹک کبھی ڈپٹی صاحب کی طرف دیکھتے تھے۔ اور کبھی اپینہ کی طرف۔  
لیکن وہ دونوں پاؤں میں نظریں گرا کر دعصمنم ارادوں کی طرح خاموش میٹھے تھے۔  
قبر کی خاموشی ان کی زبان پر تھی۔ اور موت کی زردی ان کے چہروں پر۔

(۱۲)

صحح کے بیویش ہوئے صحافی کو کہیں دس بجے جا کر ہرگش آیا۔ اُس نے ایک  
لباس انس لیا۔ اور دھیرے سے کہا۔ "بھائی"

چراغ بچوں کی طرح سسکیاں بھر رہا تھا۔ اب یہ آذانہ سنی۔ تو اُس نے جلدی سے  
آنکھیں پوچھ دالیں۔ گود میں ٹپے عصافیر کو اس طرح سینے کے ساتھ چکپا لیا۔ اور پیار  
سے اُس کی ڈاٹھی پر ماخنچہ پھیرتے ہوئے اُس نے کہا۔ "صحافی۔ عزیز"

صحافی رورہا تھا۔ آنسو گاول سے ڈھلک ڈھلک کر کپڑوں پر گر رہے تھے۔  
اُس نے دھیرے سے کہا۔ "تو وہ اُسے لے گئے بھائی؟"

چراغ خاموش رہا۔ خوف نے اس کے دل کو یوں لکپڑا دیا تھا۔ جیسے کرنی شاخ  
پر بیٹھے کسی پرندے کو ماخنچے میں لکپڑا دیتا تھا۔

صحافی نے کہا۔ "بولا۔ بھیا۔ کیا وہ اُسے لے گئے؟"

چراغ چُپ رہا۔

صحافی چڑھ کر بیٹھ گیا۔ دروازے میں سے آتی ہوئی دھوپ کو دیکھ کر اُس نے  
چونک کر کہا۔ "ہیں۔ آتنا دن چڑھ آیا ہے۔ اب تو کوئی دس گیا رہ نجھے ہوں گے  
بھائی! اتب تراس کا مقدمہ شروع ہو گیا ہو گا۔"

چراغ پھر بھی بیجا رہا۔ اس کی آنکھوں سے مسترت ایسے برس رہی ہے۔ جیسے مرد نہیں۔ ایک بیوہ عورت ہو جس کا اکلو تر بچہ اُس کے مسلمانے مر رہا ہو۔ صحرائی نے اپنے کرتے کے نیچے رات والے خنجر کو ٹوٹا اور پھر اٹھ کر کھانا بجاؤنی میں جاتا ہوں۔

تب چراغ بھی تڑپ کر لکھرا ہو گیا۔ اس نے چنان کی سی مضبوط آواز میں کہا ہے نہیں  
تم نہیں جاؤ گے۔

صحرائی کی آنکھوں سے دیوانگی برس رہی تھی۔ اس نے جیسے چراغ کی آواز سنی ہی نہ ہو۔ دھیر سے سے بولادی اب جاتا ہوں۔ شاید آنہیں سکون گا۔ اس لئے سلام میرے بھائی:

ادرتب وہ جواب کا انتظار کئے بنا ہی جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔ چراغ دوڑ کر در داری سے پر آیا۔ دو کربولا۔ "صحرائی۔ صحرائی! ایکن صحرائی جا چکا تھا۔ آسمان پادلوں سے پتا پڑا تھا۔ اور کہیں کہیں سے دھوپ تیر کی طرح نیچے زین کی طرف آ رہی تھی۔

(۱۳)

عدالت میں اتنی خاموشی تھی۔ کہ اگر یہ توئی بھی گرتی۔ تو آواز آتی۔ ہر ایک ہرمی چوپ چاپ تھا۔ ضرورتی شہادتیں ختم ہو چکی تھیں۔ ڈپٹی صاحب ملازم کے بیان قلمبند کرنے کو تیار ہو رہے تھے۔ کہ اسی وقت یہ کایک ایٹھ کر لکھ کر لکھری ہو گئی۔ وہ اس طرح زرد تھی جیسے سرسور کا پیوں ہوتا ہے۔ اور اس کی آنکھیں اس طرح بے حس تھیں۔ جیسے دو کسی مردہ کی آنکھیں ہوں۔

ڈپٹی صاحب نے اسکی طرف دیکھا نہیں۔ وہ اسی طرح اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے رہے۔

امینہ نے صیحی مری ہوئی سی دیکن مفبسو ط آواز میں شہر شہر کہ کہا۔۔۔ میرے بیان کی ضرورت نہیں۔ میں جرم کا اقبال کرتی ہوں۔ میں جینا نہیں چاہتی۔“ عدالت میں ہر ایک آدمی سُننا تھا میں کھڑا تھا۔

لیکن یہ الفاظ سُستھے ہی ہر ایک دل میں ہوک سی کونڈگٹی۔ جیسے بادری میں بھلی کونڈ جاتی ہے۔

ڈپٹی صاحب اٹھ کر ساتھ داسے گمرے میں چلے گئے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد واپس آئے۔ لوگ سمجھ رہے کہ اُس طرف یکوں گئے تھے۔ وہ بھری فدالت میں آنسو گرا نہیں چاہتے تھے۔

لیکن بہت رد کرنے پڑی ایک لمبے سافس کو وہ نہیں روک سکے تھا انہوں نے جلازی سے کہا۔ فرد جرم کے متعلق ہیرا خیال ہے کہ

لیکن اسی وقت ایک وحشی سانا تھے قدر کا بد صورت آدمی عدالت میں داخل ہوا۔ آتے ہوئے اُس نے کہا۔

خدا را انصاف کے نام پر۔۔۔ ایک لمحہ کے لئے۔۔۔

ہر ایک آدمی چونک پڑا۔ انہوں نے دیکھا۔ کہ آنے والا بھلی کی سی تیزی سے آگے بڑھا آرہا ہے۔ اور اب ڈپٹی صاحب سے تھوڑی ہی دُوری پر کھڑا ہے۔

اس نے کہا۔ میں اس مقدرے سے کے متعلق ایک نہایت ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ ہم سے نہ سُننا انصاف کا خون کرنا ہو گا۔۔۔

امینہ بیویش سی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سب طرف ناموشی تھی۔ مسکوارہ دیکیل نے آہستہ سے کہا۔“ اس مقدرے سے سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ ”

اُس دشمن سے آدمی نے جوش کے ساتھ کہا۔ سہے تو  
سرکاری وکیل نے ڈپٹی صاحب کی طرف درکھا۔ اور آہستہ سے کہا۔ اپ اجازت  
دیں تو اُس کا بیان لے دوں۔

ڈپٹی صاحب نے سربراہ کو اپنی مرضی نظر برکی۔

سرکاری وکیل نے اُس آدمی کو کہا۔ "وہاں کھڑے ہو جاؤ۔ اور پھر کہا۔ کہو۔ جو کون تھا  
ایمان سے سچ کہوں گا۔

اُس آدمی نے جوش کے ساتھ کہا۔ "جو کہوں گا۔ ایمان سے سچ کہوں گا۔

تمہارا نام

صحرا فی!

وکیل نے ترھپ کر کہا۔ "کون؟"

صحرا فی نے انتقال کے ساتھ کہا۔ "صحرا فی۔" بیس نے ہی شروع شروع میں  
کشیر سے اپنی نظمیں لاہور کے اخباروں کو صحیح تھیں لیکن جب لاہور پہنچا۔ تو ویکھا کہ  
مدرس خادم پہنچے ہی سے لاہور میں پہنچ کر اپنے آپ کو صحرا فی مشہور کر کے چکے ہیں۔ بیس  
ہی صحرا فی ہوں۔ اس کا ثبوت میری جیبوں میں بھری ہوئی نظمیں ہیں جو آج تک  
کہیں بھی شائع نہیں ہوئیں۔

"پھر۔" سرکاری وکیل نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

صحرا فی نے آہستہ سے کہا۔ "میں خصہ میں پاگل ہوا تھا۔" بیس نے اپنے بھائی  
چراغ کو ڈپٹی صاحب کے ہاں مالی رکھا دیا۔ اور خود بدے کی تاک میں رہا۔ آخر  
اسی رات کو۔ اس چاقو کے ساتھ۔ اور یہ کہتے کہتے اس نے اپنے گرفتے

کے نیچے سے رات والانجمنگر کا لبیا جس پر اب بھی خون جمبا تھا۔۔۔ میں نے اپنی آبدالہ کے لیا۔۔۔

عدالت میں ہو کا سنا تھا۔ کتنے ہی لوگوں کی مانگیں کا نپ سہی تھیں لیکن خاموشی تھی۔ اور ایسی کہ ہوا بھی کھڑی ہو گئی تھی۔

ایمنا نے ایک بار سڑاٹھا کر صحرائی کی طرف دیکھا۔ انہوں میں پتہ نہیں اُس نے کیا کہا۔ اور کیا سنا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بنتے لگے۔۔۔ لیکن صحرائی پر چاپ — خاموش —

کچھ دیر بعد گرج کر اُس نے کہا۔۔۔ ”میں قاتل ہوں۔ مجھے پھانسی دو۔۔۔ میں قاتل ہوں۔۔۔“

ڈپٹی صاحب نے بھی اُس کی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس کے دل سے ایک بھاری بوجھہ اتر گیا ہے۔

لیکن اُسی وقت عدالت کے باہر بے حد شور ہوتا تھا دیا۔

”ڈپٹی صاحب نے پوچھا۔ یہ شور کیسے ہے؟“

ورپاں نے کہا۔۔۔ ایک آدمی اندر آنا چاہتا ہے حضور! لوگ اُسے روک رہے ہیں۔۔۔“

ڈپٹی صاحب نے دیہرے سے کہا۔۔۔ ”آستے لے آؤ۔۔۔“

اور صحرائی۔۔۔۔۔۔ چرانغ پا گلوں کی طرح بال کبھیر کر عدالت میں داخل ہو رہا ہے۔ آتے ہی اُس نے کہا۔

”یہ سب جھوٹ ہے حضور۔ یہ سب جھوٹ ہے۔۔۔“

ڈپٹی صاحب نے اپنے مالی کو پہچانتا۔ اور کہا۔ "کیا بات ہے؟" چراغ نے انتہا جوڑ کر کاپنے تھے ہوئے کہا۔ حضور مسیاں خادر کو نہ صحرائی نے مارا ہے۔ نہ چھوٹی سر کار نے۔ مسیاں خادر نے خود کشی کی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے چھوٹی سر کار اُدھر دیکھی نہیں رہی تھیں۔ انہیں پتہ بھی نہیں لگا۔ کہ مسیاں خادر خود کشی کر رہے ہیں۔

ڈپٹی صاحب نے آہستہ سے کہا۔ تو پھر صحرائی نے یہاں آگرا قبائل کیوں کیا؟ چراغ نے انتہا جوڑتے ہوئے کہا۔ حضور۔ وہ چھوٹی سر کار کو بچانا چاہتا ہے۔ میں کلام پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میرا بھائی بے قصور ہے۔ اُسی وقت ایمنہ کو نہ معلوم کیا ہوا۔ وہ نجخ سے نیچے گرفتہ ہی۔ اُس کا زندگ انہما سے زیادہ زرد تھا۔ اور جسم ایک لاش کی طرح بے جس۔

وزیروں میں ایک ڈاکٹر تھا۔ اُس نے دوڑ کر اُسے دیکھا اور کہا۔ "ہیں۔" یہ کیا ہوا۔ جیب سے Ctechoscope نکال کر اُس نے پھر دیکھا۔ خوف کی ایک لہرسی اُس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ اور اُس نے پڑ مردہ سی آوانہ میں کہا۔ "ختم۔" دل کی حرکت بند ہو چانے سے —

صحرائی نے مٹا تو صم "بکم" کھڑا رہا۔ لیکن چراغ نے دیکھا۔ کہ کھڑا رہنے کے لئے اُسے کہتی کوشش کرنی پڑ رہی ہے۔ جنگلے کو اُس نے دو توں ہاتھوں سے پکڑ لکھا ہے۔ ڈپٹی صاحب اُٹھ کر اپنے گردے کے اندر چھپے گئے۔ ایمنہ کو بھی اکٹھا کر اسی کرے میں بیچ دیا گیا۔

لیکن ایک عجیب بات تھی۔ دو گوں کو اپنیتے کے مر نے کا افسوس تو تھا۔ مگر اب

بھی صحراً میں اُن کی دلچسپی کم نہ ہوئی تھی۔ ایک آدمی کی نظر میں نے ایک پُر امراء طریقہ پر انہیں اتنی دیر تک پاگل بنانے رکھا تھا۔

صحراً کا نام پچے کی زبان پر تھا۔ اور اس کے گیت ہرگلی کوچے میں گونج رہے تھے۔ اور آج وہ صحراً ۔۔۔ وہی صحراً اُن کے سامنے کھڑا تھا پہلی بار انہوں نے اُسے دیکھا تھا۔ اور پہلی بار ایسا دیکھا تھا۔ کہ اُسے پھانسی کی سزا مل جائے گی۔ اور ہمیشہ کے لئے انہیں دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔ اس لئے بہت سے آدمی ہے میک نہیں۔ دیے ہی بیٹھے رہے۔ باہر کی بیٹھی میں سے کچھ آدمی افسوس کرنے لگے۔ لیکن کھڑے سب رہے۔ مزارہ میں کی بھیر تصور یہ بنی کھڑی تھی۔

پتہ نہیں کیوں ہر ایک آدمی صحراً کے لئے بیقرار تھا۔ کیا اُسے پھانسی دے دی جائے گی؟ کیا دیتا گے اس بے نظیر شاعر کو فنا کر دیا جائے گا؟ ہر ایک آدمی چُپ چاپ دعا کر رہا تھا۔ کہ صحراً نجح جائے۔

اسی وقت سرکاری دکیل ڈپٹی صاحب کے کمرے میں گیا۔ لوگ سانس لکھنچ کر اُس کے آتے کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ باہر آیا۔ اور اس نے آہستہ سے دھیمی آواز میں کہا: ”عدالت کا فیصلہ ہے۔ کہ مسٹر خادری کی موت خردگشی سے ہوئی۔ مرحوم بیگم اینبارہ میں جاتی ہیں۔ اور مسٹر صحراً تم جا سکتے ہو۔۔۔“

پتہ نہیں صحراً نے ان الفاظ کو سنا یا نہیں سننا..... لیکن لوگوں نے خوشی سے چلا کر کہا:-

”شاعر صحراً زندہ باد“

عدالت کے اندر ہر ایک ہڑ سامچ گیا۔ ہر طرف سڑی سر نظر آئے گے۔ لوگوں کے

جوش کی کوئی انتہا نہ تھی۔ انہوں نے چلا کر کہا۔

### ”شاعر صحرائی زندہ باد“

اور پتہ نہیں۔ لب کسی نے صحرائی کو پکڑا۔ اور اُسے عدالت سے باہر لے آیا۔ ایک موٹے تازے آدمی نے اُسے کندھے پر بٹھایا۔ اور ایک اُپنی جگہ پر کھڑے ہو گرا کہا۔ ”دنیا کا عظیم تریں شاعر زندہ باد“ اور پھر پتہ نہیں کسی نے اُسے ایک موڑیں بٹھایا۔ موڑ کے چاروں طرف ہزارہ انسانوں کا سمندر اتھارہ باتھا۔ اور بار بار آسمان کو گونجاتی ہوئی ایک صد سُنّائی دیتی تھی۔

### ”شاعر صحرائی زندہ باد“

لیکن صحرائی دھیرے دھیرے بیویش ہو رہا تھا۔ بیویشی ہی جیویشی میں ایک بالائی نے کہا۔ ایننا..... لیکن کسی نے بھی اُس کی اس کمزور آواز کو نہیں سننا۔ انہوں نے چلا کر کہا۔

### ”غریب صحرائی زندہ باد“

ایک جلوس ساہنے کر شہر کے بڑے بانے اور میں سے جانے لگا۔ پچھلے جو شیدے رکوں نے صحرائی کا ایک پورا نامگیت گاتا شروع کر دیا۔ بیچ زیج میں کوئی زیادہ منچلا آدمی چلنا انتہتا تھا۔

### شاعر صحرائی ————— زندہ باد

لیکن اچانک موڑ کھڑی ہو گئی۔ ڈرائیور نے دھیرے سے کہا۔ ”انہیں دیکھو تو“

دو گوں نے دیکھا۔ صحرائی کا سر دھکا گیا تھا۔ . . . .

اُس کی جان نکل گئی تھی۔

جلوس رک گیا۔

لیکن دُور کے چند آدمیوں نے کچھ بھی نہ سمجھ کر کیا۔

”شاعر صحراٹی زندہ باد“

قبرستان میں خاموشی تھی۔ دو جنائزے والی پہنچے۔ اُس کے ساتھ میرا۔ ہال شخص تھے۔ لیکن سب خاموش۔

رات کی تاریکی میں عدم آباد کے مسافروں نے ہوئے تھے۔ اور دو آدمی آہستہ آہستہ دو قبردیں کے پاس پہنچے۔ جو پاس پاس تھیں۔

ایک نے کہا۔ ”د کون؟“

دوسرے نے کہا۔ ”یہ ہوں ڈپٹی صاحب پیراگ۔“

اور پھر ایک بوڑھے آدمی کی سیکیوں نے قبرستان کی خاموشی کو توڑ دیا۔

اُسی وقت دُور پر سے ایک درخت پر کوئی نہ کہا۔ — کو او — کو او —

۱۳۰ - ۹  
۵۳۰



# طلائی مر

احمد ندیم شاہی

لہ پنجابی میں تھے کے جو مر کر کتے ہیں +



ہڈیاں چھپیں، پسلاکیاں چرچڑائیں۔ اور سو کھے لگوں سے پُرہنہ چھپیں ملند ٹھوٹیں۔ ایسا بجھی نہیں ہو سکتا! ۶

اور اب پتواریوں اور نمبردار دل کے ہجم میں سے تھانیدار اپنی پگڑی کو ڈھنھ کرتے ہوئے نکلا اور کڑ کا۔ ”ایسا فسرور ہو گا۔ یہ میرا حکم ہے۔ اور میرا حکم اس علاقے کا قانون ہے۔ جیونہ بھر کے لئے تم اپنی زمینوں میں ہل نہیں چلا سکتے۔ نہ تم کھیتوں کی دیکھ بھال کر سکتے ہو۔ نہ گوجھی کی گیاریوں کو پافی دے سکتے ہو۔ تم نے ڈاکو دل کو پناہ دے رکھی ہے۔ اور جب تک تم اپنے کئے کی سزا نہیں ہیگتو گے تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں آئیں گے۔ تم لا توں کے بھوت ہو!“ ۷

ایک پھٹے ہوئے چوٹے والا نوجوان مجمع کو چیر کر آگے بڑھا۔ اس کے گھے کی گلیں چھپیں ہوئی تھیں، بازوؤں کے پھٹے تی گئے تھے۔ اور زنگ چند رکی طرح لال نخا۔ وہ تھانیدار کے مقابل جا کر پکارا یہ لیکن ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ہم مر جائیں گے۔ ہم غریب آدمی ہیں۔“ اور مجمع سے دبی دبی آوازیں آئیں۔ ”اے فیض، فیض! کیا کرتے ہو۔ چیچپے ہٹ آڈ۔“ اور سامنے سے تھانیدار نہادت تند بجھے ہیں اس کی ماں اور بہن کی آپروریزی کرتا ہوا دھاڑا۔ ”یہ منہ پھٹ چھپ کر کون ہے؟ بد زبان، بے حیا۔ ارے تم غریب ہو۔ تو یہ تمہارے اپنے ماتحتے کا لکھا ہے۔ تمہاری غریبی میرے حکم کی راہ میں روڑا بن کر کیوں اٹھے؟ کل شام تک

تم سب اپنے جھونپڑے چھوڑ چھاڑ کر گاؤں میں جا بسو۔ پورے ایک میٹنے تک نہ ہل چلا وہ نہ کھیتوں کی دیکھ بجاں کر دے نہ گر بھی کوپانی دو۔ ورنہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ میرے بیتوں کی ضرب اس قدر سخت ہے کہ بے شمار بد معاش آج تک ماتھے پر پیاس پاندھے میرے ساتھ سے چھپتے چھرتے ہیں۔

ایک بڑھا کھوست پری طرف ایک بیری کے تنے کا سارا بیکراشتہ ہوتے بولا۔

”ہم پر رحم کیجئے۔ ہم پر رحم کیجئے مالک۔“

اور تھائیندار پیٹ کر جاتے ہوئے بولا۔ نہیں پھر ہوں۔ اور پھر حرم نہیں جانتا۔ میرا حکم اس علاقے کا قانون ہے!

اور دوسرے سفید بادل کے ساتے میں ایک بازاں ایک بھٹکے ہوئے نیلے کبوتر پھیپھیا وہ اسے پنجوں میں دبوچ کر ٹھپے کھجے پر فضا میں بکھرنا، تھانے کی کالی عمارت کی طرف اڑ گیا! ان دونوں علاقوں میں دُوڑا کو پھر ہے لئے جہنوں نے قرضے کے روچھے سے تنگ کر گاؤں کے ایک بیٹھ کا پیٹ چاک کر دیا۔ اور لمبی لال پوچیاں جلا دیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ مفرود پلبیس کی زندگی آگئے۔ مگر پلبیس والوں کو معلوم تھا۔ کہ ان کے پاس سرحد پار کی بندوقیں ہیں۔ اور ان کی بے پناہ نشانہ بازی کے چرچے تو دُوڑ تک پھیلے ہوئے رہتے۔ وہ ڈاکو گاؤں کی آمد کی خبر پاپتے ہی دردیاں پہنچنے اور پیشیاں کرنے لگتے۔ اور ڈاکو اندر چیری گھائیوں کے گہرے تاروں میں دیکھ جاتے۔ اور پھر اور پر پر پر بیچھ دی جاتی۔ کہ گاؤں والے ڈاکووں کو چھپائے دکھنے پر مستحق ہو گئے ہیں۔ لیکن ان پر مناسب دباو ڈالا جا رہا ہے۔ غنقریب نہیں برد نہ نک پوچھے گی۔ گاؤں پر بھچلے دو ہمینوں سے تعزیری پڑھو کی کادیو بھی مسلط کر دیا گیا۔ اور وہ لوگ جو صبح جوکی روٹی کھولتے ہوئے پانی کے ساتھ نخل کر شام کے کھانے کی فکر میں عرق ہو

باتے تھے۔ ہر جیسے بچھر رقم میا کرنے پر مجبور کر دیتے گئے؛ اس سلسلے میں اتنا سننے میں آیا۔ کہ ایک بوڑھا اپنی کنواری بیٹھی کارات بھر غائب رہنا صرف اس لئے برداشت کر لیتا ہے کہ صحیح سوریرے اُس کی ڈبڈاتی انکھوں والی لڑکی اس کی متسلی پر چوٹی یا اٹھنی رکھ دیتی ہے اور ایک بڑھیا جس کا خاوند مر جپا تھا اور شے کی بنا پر پھانسی چڑھ گیا تھا، کھاتے پیتے دگوں کاغذ پیتے پیتے چکی کے پاؤں پر سر رکھ کر ٹھنڈی ہو گئی! اور جب اس قدر سختی کے باوجود داکوؤں نے خود بخود تھانے آگرا پنے آپ کو پولیس کے حوالے ن کیا تو اُپ سے حکم بیا گیا کہ گاؤں سے باہر جو لوگ کھیتوں کی حفاظت کے لئے جھونپڑوں میں رہتے ہیں، داکوؤں کو پناہ دیتے ہیں۔ اس لئے انہیں ہل چلاتے، کھیتوں کی دیکھ بحال کرنے، اور گوجھی کی کیاریوں کو پانی دینے سے روک دیا جاتے۔ تاکہ وہ اس دباو سے تنگ ہاگر سرکار کا ہاتھ بٹھا سکیں۔

زینہ بیٹھنے سے اکڑ گئیں، بکھیت فرج جانے گئے؛ گوجھی کے پھپوں پر گرد جم گئی۔ لیکن حکم حاکم مرگِ مخالفات پڑھ سادھے پیٹھے رہے۔ کبھی کبھی دبے پاؤں اپنے کھیت دیکھنے پڑے جاتے۔ اور زینہ بھوں کی خشک گھاس پر جبی ہوئی تنگ کی چادر اُن کے پاؤں کے نیچے چھپتی تو اُن کے کلیجے کٹ جاتے! اور جب گوجھی کے فرج جانے پتوں پر زردی بھری ہوئی دیکھتے تو اُن کے روئیں روئیں سے چنگا ریاں جھٹرنے لگتیں۔

لیکن اس قدر تباہی کے باوجود فیض کی کیا ریاں اسی آن بان سے نہ ملتی رہیں۔ اور جب شام کو تماروں بھرے آسمان کے بال مقابلہ منڈ منڈ بیرونیوں کے آنسو ساتے جنم کر رہ جلتے۔ اور جب جھیل کے اس طرف کوئی بیٹھکی ہوئی مرغابی کنارے کی کافی میں پھر پھرا تی ہوئی گھس جاتی تو فیض گھر سے باہر سکلتا اور دیواروں سے مل مل کر چلتا۔ جھواریوں کے پیچے دیکھتا، آبادہ ہوں سے کتراتا، اپنے کنٹیں پڑھا جاتا ہے۔ اور اس میں ٹین کا ڈول لشکار ملا

کر پانی نکاتا اور گوجھی کی کیا ریوں کو بہرنی کر کے موٹے موٹے چاند ایسے پھول اکھیر کر ایک ڈکر ابھرتا اور قبے کے بڑھے بزری فردش کے ہاں پہنچا کر گاؤں لوٹ آتا۔ اور جب بجھپٹے کے وقت لوگ مسجد کی طرف جاتے، اور دن چڑھے واپس آتے تو فیض کو اپنی جھکی ہوئی ڈیوڑھی کے اندر بھوری گاتے کے اُس طرف ایک موٹا کمبل اور بڑھے فراٹے بھرتا پاتے۔ فیض گاؤں بھریں ایک شر میلا اور کم تہت نوجوان سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اپنے دوست فتح ویں کے بیاہ میں شریک ہونے کے بعد اچانک اس کے دل نے ایک پھر ریمی لی اور دوسرے روز اس نے اپنے ایک دشمن پر ایک گلی میں بے دھڑک آدازے کسی نیچے اس کے ہم عمر دوست بہت سث پتا تے اور فیض کی فطرت کے اس ترب دوست پلے پر قسم قسم کی خیال آلاتیاں کیں۔

”کہیں سے پستول ہاتھ لگ گیا ہو گا؟“

”ابکے اس کی گوجھی کی کیا ریاں آباد ہیں نا۔“

اور اس قسم کی دیگر باتیں۔ لیکن ہسل بات کسی کو نہ سوچھی سا اور وہ بات بہت چھپی چھپی ہتی۔ یکونکہ اس بات کو صرف فیض اور سو فیض ہی جانتے تھے۔

سو فی گاؤں کے بڑھے چوکیدار کی لڑکی ہتھی۔ بہت شر میلی اور سہی سہی جیسے گلاب کی کلی جو سورج کی روشنی اور گستاخ جھونکوں سے لجا تے اور پتوں میں جھپٹ پھٹپ جائے؛ باپ کی الکوتی بیٹی ہتھی۔ اس نئے اپنی مرضی کے مطابق بنی ہٹھی رہتی ہتھی۔ گلابی پاؤں میں بزر پھر ٹے کا جوتا، پیلی چھینٹ کا لہنگا۔ جا پانی اُدے رشیم کی قیص۔ سر پتار دل بھری اور ہٹھی۔ ناک میں چاندی کی موتی ایسی کیل۔ کافروں میں جھمر جھمر کرتے بندے، جن کے نیچے شبنم کے قطرے میں لس کرتے رہتے۔ گلے میں سنہلی جس سے چاندی کے

گھنگرد لٹکے رہتے۔ گورہی گورہی باہوں میں وصافی دار چوڑیاں اور پھر پاؤں میں بسرا جوتوں کے اور نہنوں سے لپٹی ہوئی جھانجھنیں جو ہر قدم پر ایسا دلاؤ زیر چھنا کا پیدا کرتی تھیں جیسے بیشاہ کو لمیں نیم کے چھتنا روں میں چھپی رُک کر کوکو پُکار رہی ہوں!

فیض، فتح وین کی شادی پر اپنا بہترین لباس پہنے اپنے دوستوں کے ہمراہ چھت پر بیٹھا کنوار یوں کے گیت سن رہا تھا۔ آنھوں لڑکیاں مل کر گاتیں۔ جوان میراں ڈھولک بجا تی، دانت نکالتی اور جھومنتی۔ اور جب گیت کا آخری سرنازک گلوں میں ڈھم ہوتے ہوئے ختم ہو جاتا۔ تو ڈھولک کی دھماکہ ڈھپ کے ساتھ نتے گیت کی ابتداء ہو جاتی۔ کوئھوں پر گاڑی داسے دبکے بیٹھتے۔ اور ٹنڈ منڈہ بیریوں اور نیموں میں شربہ بچتے چھپے ہی گیت سن رہے تھے۔ اور نیچے سخن میں لال اور پیلی اور صنیاں اور ادوے اور گلابی لہنگے لا تینوں کی پیلی روشنیوں میں مشتی ہوئی قوس قزح کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ایک نیا گیت شروع ہوا میراں کی انگلکیاں ڈھولک پر والہانہ رقص کرنے لگیں اور لڑکیوں کی تپلی ٹپلی آدازیں بلند ہوئیں۔ جیسے کوئی ساندھہ آنھوں سازنگلکیاں گودیں دباتے بیک وقت آنھوں تاروں کو جھنپھنارا ہوا کہ اچانک سب لڑکیاں خاموش ہو گئیں، اور سارے ٹیاے منظر کو ایک نہ آداز کا یہ رشتہ ترچیرتا ہوا افق کی طرف اڑ گیا۔ الف نذر فضا میں کر دیں لینے لگے۔

”تیرس ترس کرجی اور نہیں غیر کمر

کہ ترستی زندگی اور عینی موت۔!“

اور اچانک آداز رک گئی۔ اور گانے والی کو احساس ہوا کہ شریک لڑکیاں اس کی

آواز نشانے کے لئے چپ ہو گئی تھیں اور وہ اس ساتھ پر غصے اور شرم کے مارے میراث کی ڈھونک کے قریب فرش پر سر کھکھ سہمی گٹکنے لگی۔ اور لڑکیاں جھجک جھجک کر اور بیٹ لیٹ کر اس قدر تھیں کہ جیسے سارے اندھیرے منظر میں ستارے توٹ توٹ کر بکھر گئے:-  
چھست پر بیٹھے ہوئے نوجوان ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مُسکرائے۔

ایک بولا:- آواز تھی یا سونے کا ایک تیر تھا۔ جو دلوں کو چھیرتا ہوا پار ہو گیا۔  
دوسرے نے کہا:- آواز تھی یا اس کیوں ترکی اڑان تھی جس کے پنجوں سے گھنگڑ بندھے ہوتے ہوں۔

اور ایک طرف سے فیض دلی آواز میں بولا:- آواز تھی یا شفاف تالاب کی ترہ میں ٹانپی کی گھنٹیاں زخمی ہیں۔  
نوجوان رُک کر سہنے ایک دوسرے سے لپٹ لگئے اور فیض کو ٹھوکا دیتے ہوئے پولے:-

”کچھوا، اور نلپے!“

”بینڈوک، اور ٹھمار گانے!“

چھپھوندرہ اور سرپیں ٹھنڈیلی کا تیل ڈالنے!“  
اور فیض اپنی ذرا فراسی موچھوں پر انگلی چھیرتے ہوئے بولا۔

”دیختی ہمارے بھی دل ہے!“

اور سب نوجوان چُپ ہو گئے۔ جیسے انہیں فیض کی یہ دلیل پسند آئی ہو۔ اتنے میں منڈیر کے قریب سے ایک نوجوان سڑاٹا کر بولا۔  
”ملیکیں یہ تھی کون؟“

”سوئی!“

”سوئی؟“

ہاں، چوکیدار کی لڑکی۔ وہ جو بھڑکیے کپڑے پہنتی ہے۔ اور الجاتی رہتی ہے:

”ہاں ہاں، دو بھلی۔“

”اچھا وہ جادو گرفتی۔“

اور جب آدھی رات کو لوگ ہوئے ہوئے اُٹھنے لگے، اور لڑکیاں بھی لمبے بھر کے لئے آرام کرنے کے لئے سوگئیں، اور کچھ اپنے اپنے گھروں کو چل دیں، تو فیض ایک اندر ہیری تنگ گھلی میں یہ سوچتا جا رہا تھا کہ بعض لوگوں کی آواز میں کتنی مشہاس ہوتی ہے۔ جیسے کافی زان

کے رستے کوئی شہد کے گھونٹ پلار ہاہے ہے اور اس کا جسم تپ گیا۔ اور دل ناچنے لگا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ اس کا یوں نکون بن کر میٹھے رہتا اس جوانی کے ماتھے پر کا لابد نمادانع ہے اور سوئی یا کسی الہڑلڈکی کوہا ہوں پڑا الکراندھیری گھایوں میں دھیرے دھیرے توستی زندگی اور ستری مدت کے گیت گھانے میں جو کیفیت ہے، وہ آرام سے خندی ہوا کے ہنکوڑ میں لمبی تان کر سخنے میں بھی نہیں۔

چونکا اس کا گھر گاؤں کے پہلے سر پر پڑتا۔ اسلئے اُسے یہ انوکھی باتیں سوچنے کیلئے بہت دلت بلکہ اور جب وہ ملپٹے قبرستان کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے قریب سے گزر رہا تھا۔ تو چھڑ کر تے جھینک کر اچانک چپ ہو گئے۔ اور ڈیاں اپنی طویل اور باریک پیس پیس کو روک کر دم بخود رہ گئیں۔ ساری فضا پر ایک خوفناک خاموشی چھا گئی۔ کہ اچانک فیض نہش کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے کانجھ کی چوڑی پر کی آواز سنائی دی۔ اور اسے احساس ہوا کہ کوئی لڑکی اس سے دس بارہ قدم کے فاصلے پر بیٹھی چوڑیاں کھنکھنار ہی ہے۔ اور یہ کھنکھناءیٹ فیض کو فتح دین کے صحن میں لے آئی! اور پھر دھر گرجتی ہوئی ڈھونک اور جھجومنتی ہوئی میراثی وہ رنگارنگ بیاس اور

وہ چڑیاں — اور پھر سوئی کی آواز، جو اندر ہیرے منظر کو چکا چوند کرتی اُن قی کی گود میں سو گئی — اور اسے ترستی زندگی اور غہشتی موت کا خیال آیا — موت اور ٹوٹی ہوئی قبروں والا قبرستان! — سو لکھے ہوئے دھپر اور خوفناک ڈائیں، جو راتوں کو چڑیاں بجاتی ہیں، اور شکستہ دیواروں کے سوراخوں میں راہ چلتیں کو دبوچنے کی تاک میں جھپپی رہتی ہیں۔ لمبھے بھر کے لئے اس کے دل پر جیسے برف کے گائے پڑ گئے! لیکن اچانک ایک فہراري حالت میں وہ گرج کر لپکا را:-

”کون ہے تو؟“

”سوئی! آداز آتی۔ اور فیض کو محسوس ہوا۔ کہ واقعی قبرستان کے ایک کونے پر چھوٹے ہے گڑھے میں پانی جمع ہو گیا ہے۔ اس کے نیچے کسی سوئی ہوئی جل پری نے جس کی کلاں پر چاند می کی نیخنی نیخنی کھٹیاں سچ رہی ہیں۔ کر دٹ بدلی ہے جسم کے ہر سام سے پھوٹنا ہوا پسینے اور پسینے کے ہر قطرے میں چھاتی ہوئی چینگاریاں اور دھکتا ہوا اور ہپنکتا ہوا بدن اور رقص کرتی ہوئی روح! — فیض کے اوسان لڑکھڑاتے اور اس انہیں منظر کی خشک تھاتی میں اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سوئی کے ہمراہ کسی دور درانہ نکل کی طرف اڑا جا رہا ہے۔ اس حالت میں کہ سوئی کا سراس کے کاندھے پر ہے۔ اور اس کی زلفیں فضا میں مسحور ناگنوں کی طرح لمرا رہی ہیں۔ اور اس کے ٹخنوں کی جھانجھنوں کے چھنائے سے فضا کنگنا رہی ہے!

اچانک جھینگر دل اور دل دل کی مسلسل تائیں خاموش نظاروں پر نشتر زنی کرنے لگیں، اور فیض اس قبرستانوں اور تاریکیوں کی دُنیا میں لوٹ آیا۔ اور بولا:-  
”یہاں کیا کہ رہی ہو سوئی؟“

اور سونی بھرائی ہوئی آواز میں بولی "یہاں میری سونے کی ٹبرگر پڑی ہے میں نے  
یہ ٹبرجاگیردار کی بیٹی سے آج رات کے لئے لی تھی۔ اور میں اب فتح دین کے لئے ٹھہرے  
کر آ رہی تھی کہ یہاں مجھے چند ایک ہمیلیوں نے چھپا۔ اور مجھے مخول میں مجھے ٹبر کا خیال  
چڑھا۔ اور جب میں ٹھہر پوچھی تو ماتھے کو خالی پا کر میرا داں دہل گیا۔ واپس آ کر یہاں اندر ڈھیرے  
میں خاک پر ماٹھہ ڈھیرہ ہی ہوں۔ دُدقی ہوں ٹبر خاک کرنا وہ روشنی ہوئی تب دُن ہیں  
گر گئی تو کب ملے گی۔ اور مجھ پر پاپ بہت خفا ہو گا۔ کہ میں نے دم بھر کی روشنی کے لئے  
ایسا غصہ بڑھایا"

فیض کا جو بھرا یا جیب سے ذبیان کالی اور ایک دیا مسلمانی روشن کی۔ پہلی نظر  
ٹسونی کے ماتھے پر پڑی جس کے عین وسط سے سیدھی مانگ پاک کراؤ پر اور ٹھنی میں چھپ  
گئی تھی! اس کی آنکھیں ٹھکانی ہوئی تھیں۔ اور پسکے پسکے ہونٹ کھلکھلے ہوئے تھے۔ اس کی  
لکھنی الیکٹرانیوں میں کانچ کی چوڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور اس کے ماٹھہ خاک کا لوڈ تھے۔  
وہ فیض! وہ تھجب سے پکاری! اور فیض خوشی سے ہانپئے لگا۔ کہ سونی اس کا نام جانتی  
تھی۔ اور کسی دو شیزہ کو ایک فوجان کا نام یاد رہنے کا یہ مغلب ہے کہ اس فوجان میں کوئی  
خصوصیت ہے۔

چھرد چھرر، دیا مسلمانیاں جلتے لگیں اور زمین نرچھبتو ہوئی چنگا ریوں کے ڈھیرنگ  
گئے۔ اور آخر کار فیض ایک قبر کے گنے کے جلی ہوئی جھاڑیوں کی جڑیں سے ٹبر اٹھا لایا۔  
وہ فیض سے پوچھا اور سونی کے ماٹھ پر رکھتے ہوتے کہا "سو نی، شکر ہے مل گئی" اور  
جب اس کی خاک آ کر دُنگلیاں سونی کی خاک آ کر دُنگلیوں سے مس ہوئیں تو اندر ڈھیرا  
اور زیادہ گمراہ ہو گیا۔ ندیاں چیخ اٹھیں اور جھینگر چلانے لگے اور دونوں نے محسوس کیا کہ

ان کے جسم کی پکپار ہے ہیں۔ ان کی آنکھیں ڈبڈ باؤ آئی ہیں۔ اور ان کی انگلیاں پیچ رہی ہیں کا نہتی ہوتی آواز میں سونی بولی۔ تم نے بہت تکلف کی قبرستان کے کنارے،

قبردیں کے درمیان ماتھ پھیرتے پھرنا بہت حوصلے کا کام ہے۔

اور فیض بولا۔ اور یہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ہماری ملاقات قبرستان کے کنارے اور قبردیں کے درمیان ہوئی۔ اور سونی یہ اندرھیرا کتنا گمراہ دکھنے کا خاموش ہے۔ اور سونی، تم نے وہ ترسی زندگی اور سہستی موت کا گیفت کتنا اچھا گایا تھا۔ لیکن سونی تم شرعاً کیوں گئی تھیں۔ اور تم اب کس رستے سے گھر جاؤ گی، کہ تو میں تمہارے گھر پہنچا آؤں۔ اور سونی۔ سونی، تم میرا نام کیسے جانتی ہوئے؟ اور سونی اندرھیرے میں ٹوٹی ہوئی دیوار پر ماتھ رکھ کر راشتی ہوئی بولی۔ میں تو تمہارا نام مدت سے جانتی ہوں۔ کیونکہ تم میری پھوپی کے پڑوں میں رہتے ہو۔

اور فیض یہ بھولا بحال اجواب میں کر جھینپ سا گیا۔ اور بولا۔ ایکیلی جاؤ گی؟

”ماں کیا ہرج ہے۔ ادھر جا گیردار کا تابجھی کبھی جھپٹ پڑتا ہے۔ ورنہ کیا ہرج ہے؟“

اور پھر جب فیض اُسے ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے پاس پہنچا کر واپس دشمنے لگاتو سونی بولی۔ ”تم نے بہت تکلیف کی!“

بہت پرے ایک گلی کے نکڑ پر بیٹھا ہوا بوڑھا چوکیدار چلا یا۔

”خبردار بھائیو۔“ اور فیض نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہارا باپ جاگ رہا ہے۔

ہوئے ہوئے چلو۔ تمہارے سخنوں کی جھاجنوں کا چھنا کاہ میں لے کا۔“ اور

فیض نے محسوس کیا کہ سونی اندرھیرے میں مسکرا رہی ہے!

وہ رات کی وجہ سے سونی کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن آتنا ضرور ہوا کہ اس

کے دل و دماغ پر ایک خاص سپکر کا نقشہ جنم گیا جس کی ماں تاروں کو گھول کر بنائی گئی تھی۔ اور جس کا خوبصورت سینہ اور ابھرے ہوئے کوئے اور سفید نہنوں پر گنگنا تی جھانجھنیں اور گرد آلو دانتا اور سپتی انگلکیاں اور۔۔۔ اور وہ بہت سی باتیں تھیں جن کا اُسے پسے کبھی خیال تک نہ آیا تھا۔ لیکن جواب ایک مکمل شکل اختیار کر کے اُس کے دماغ کی شریاذیں میں نشے بن کر گھوم رہی تھیں۔

اور یونہیں زندگی کے اڑتے ہوئے لمحوں میں فیضِ اورستونی نے چند ایسی گھڑیاں چُن لیں جن میں ان کے دھڑکتے دل رُک جاتے۔ اور جھیکتی انکھیں ایک دسرے کو گھوڑتی رہ جائیں۔ اورستونی گلیوں میں سینہ تانے، بازو اہراتی، آنچل پھر پھر اتی، کونڈے کی طرح پسکتی ہوتی پھر تی گلیوں میں عاتب ہو جاتی۔ اور فیضِ تھنھی تھنھی موخچوں کو بل دے کر ایسے ایسے پھرا جاتا کہ کسی بیل کی پیچھے پر رکھتے جاتے تو وہ پچک کر زمین سے لگ جاتا!

اب ستونی کی ایک سہیلی کا بیاہ نزدیک تھا۔ اور جاڑوں کی ایک سرورات کو جب سارے گاؤں پر ایک کمراسا پھیلا ہوا تھا۔ اور بکھری ہوئی کھیتیوں کے کنارے ڈڈے چڑچار ہے تھے۔ ایک کھنڈر کے پاس فیض نے ستونی کے صاف چہرے کو اپنے دلوں ہاتھوں میں سنبھال کر اور آنکھوں میں انکھیں ڈال کر کہا۔ تم اتنی گھبرا کیوں رہی ہو؟ میں لے آؤں گا تمہارے لئے سونے کی ٹھر۔ میں ابھے گوجھی کی دقدم اٹھا کر تار ہوں گا۔ اور تمہاری سہیلی کے بیاہ سے دو چار دن پہنے کو رے سونے کی ایک چمکتی دمکتی صریحہ تھا۔ اس چاند سے ملتے پر جھم جھم کرتی نظر آئے گی۔ اور ستونی شاید تم نہیں ہانتیں کہ میں اس قسم کی کتنی صریحی تھا۔ قدموں پر بچادر کر سکتا ہوں۔ اور ستونی۔۔۔ ستونی، تم

## لکھنی رچھی ہو با۔

اور سونی نے فیض کے بالوں میں بخشی ہوئی نسخی سی لکنگھی کو اپنی انگلیوں میں لگھا کر کہا۔ تمہیں تخلیف ہو گی فیض۔ اور سونے کی ہمراہ ہیں جا گیردار کی بیٹی سے مانگ لوں گی۔ اور پھر اچانک انہیں پہلی رات یاد آگئی۔ جب جا گیردار کی بیٹی کی خبر ایک دھنسی ہوتی قبر کے کنارے جلی ہوتی جھاڑی کی جڑوں میں پڑی ملی لھتی۔ اور پھر وہ انگلیوں کا آتشیں میں! اور اس کے بعد وہ خاموش راتوں کی پر شور گھڑیاں۔ دو نوں کمرے کے دھنڈے سایلوں میں ایک دسرے کی ڈبڈ باتی پتلیوں میں ماضی کا نامہ دیکھنے لگے۔ اور تپ تک دیکھتے رہے جب ایک مرغ نے دُور ایک نیم کی شہنی پر اس زور سے پانگ دی کہ سونی کا جسم کا تپ گیا۔ اور فیض کی انگلیوں جھپٹ گئیں! اور اب تھائیندہ اس کے حکم سے لوگوں کو گنجی کی کیا ریوں کو پانی دینے سے روک دیا گیا۔ لیکن راتوں کو فیض کے کنوئیں سے بے شمار ڈول چھکلتے ہوئے نکلتے اور گنجی کی کیا ریوں میں سرگردی ہو جاتے۔ لوگ فیض سے شکایت کرتے کہ ”تم چمکا دڑکی طرح دن کو کیوں سوتے ہو؟“ اور فیض جواب دیتا کہ ”جب انسان بیکار ہو تو رونے یا سونے کے سوا وقت کیسے کہے؟“

اور پہیں دن بعد جب فیض کے پاس چودہ روپے جمع ہو گئے، تو وہ قبیلے کے سُنار سے ایک ہر بُنوا لایا جس کے پیچھے گولاکھ چھپی ہوئی لھتی۔ لیکن جس کے سامنے سوتے کا ایک پتلا پترا جملگ کر رہا تھا۔ اور جس کے ساتھ نسخی سیپوں ایسے پترے اور شفاف شبکم ایسے سوتی پوں لٹک رہے تھے جیسے چاند کے کناروں پر کسی نے چالر مانگ دی ہو۔

شام کو دہ گاؤں سے آؤ دہ میل کے فاصلے پر پونچا تھا کہ راستے کے کنارے گنجان  
جھاڑیوں کے جھرمنٹ میں سے چار ساتے پلکے اور اُسے دبو جیا۔ وہ بہت چینچا چلایا  
وچہ پوچھی۔ لیکن اُسے گھیٹ کر چوپال پر لا یا گیا۔ یہاں تھانیدار گیس کی روشنی میں اپنے  
لبے طڑے سیمیت بیٹھا سامنے گھور رہا تھا۔ فیض کو دیکھ کر اُس کے نتھنے پھول گئے اور  
ہمراڈ پر فضا میں اٹھ گیا اور پھر شراب شراب کا شور۔ اور تو کے پھٹے!  
لیکن! حرامزادے! بد معاش ما اور جانے کیا کیا۔ اور پھر اودھ موتے فیض کا گھر  
بنا ہوا جسم بوڑھے چوکیدار نے گھیٹ کر ایک طرف کر دیا اور تھانیدار پُکارا کہ "رات  
کو چھپ چھپ کر اس نے کیا ریوں کو پانی دیا ہے۔ اور گوہی کے پھول نیچے ہیں۔ میرے  
حکم کی خلاف درزی کرنے والوں کا انعام تمہارے سامنے ہے۔ میں تمہیں بتا دینا  
چاہتا ہوں کہ اگر پھر کوئی اس قسم کا بد معاش میرے ہتھے پڑھ گیا تو میں اس کی بوشیاں  
ذوچ کر کتوں کے آگے ڈال دوں گا!۔۔۔ میں تمہاری ماڈیں اور بیٹوں۔۔۔"

اور پھر وہ قانون سے پٹی ہوئی گلیاں اپانک سنان ہو گئیں۔ تھانیدار پیچوان کے  
کش لگاتا اندر گدے گدے پلنگ پر دراز ہو گیا اور بوڑھا چوکیدار اُس کے پاؤں دیانتے  
لگا۔ فیض چوپال کی بیڑھیوں سے کھسک کر اُتر اور کراہتا ہوا گلی کے اندر ہیرے میں  
چھپتا قبرستان کی شکستہ دیوار کے پاس بیٹھ کر ستانے لگا۔ اور تار دل پھرے  
آسمان کے بال مقابل جمے ہوئے ٹند بیریوں کے آنسو سی سایوں نے دیکھا کہ ایک لٹکی  
نے جس کے نخنوں سے پٹی ہوئی جھانجیں ہر قدم پر ایک دلادیز چھپنا کا پسدا کرتی  
ہیں اور جس کی ناک میں موتی ایسی چاندنی کی کیل ہے۔ اپنی پلی چھینٹ کے لئے  
سے اس کے ذمہ ہونے اور جب فیض کی خون آلوڑ انگلیوں نے ایک طلاٰتی مہر

اُس کی خاتمی انگلیوں میں چمادی تو انہیں اگرا ہو گیا۔ ستارے ماند پڑنے کے مددیاں  
اور جھینکر پیخ اُٹھئے! اور ملام، دھکے ہوتے، بھیگے ہوتے گاں ایک زخم خردہ چوری  
چھاتی پر پہست دیر تک پڑے دھڑکے ترا ہے!

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



نگو

عائشہ خانون قسم

شام کی جوانی فضاؤں پر بے طرح سلطنتی۔ ”گناہ آباد“ کے جوبن پر نکھارتا۔  
گھٹاؤں کا مستانہ رقص خدابات کی دنیا میں آگ سی لگارہاتا۔

کیا لوگی؟

چار آئے دوں گا۔

ایک روپیرہ لینے والی کی شکل تو دیکھو  
آنکھیں ہیں یا مذہرتا کے چھکلتے ہوئے کھوئے  
دیواںہ بنانا ہے تو . . . .

ہمارے صنم کی کمرہی نہیں ہے

غرض اس قسم کے مہاروں آدازے ہوئوں سے اڑاکر کانوں کے پردوں  
سے نکلا رہے تھے۔ انسانی مکبیوں کے بے پناہ ہجوم شرمی ہوئی مگر زندہ نعشوں پر ہم  
بھن کر رہا تھا۔ سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورتیں پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے عصمت کے  
امول مو قیثار ہی تھیں۔

ملکت حُسن کی البیلی تا چدار نجوبھی قدم قدم پرستیوں کی باشیں برساتی  
ہوئی پالا خانے سے اڑاکر کمری پر آبیٹھی۔ وہ حسین تھی اور جوان بھی۔ اُس کا  
حُسن پھپٹوں کے ہوئوں پر مچانے والے تباہ سے زیادہ شاداب اور اُس کی جوانی

گیتوں میں کہ ڈیس لینے والے کیف سے زیادہ محنت کوں نہی۔ وہ ہنستی تو موسیقیاں اُس کی ہنوں پر انگڑا تباہ لیتیں۔ اُس کی آنکھیں جس طرف اٹھتیں دلوں کو سینوں سے خود مکر دیتیں۔ تماشائی آتے دیکھتے اور سینوں پر ہاتھ رکھ کر آگے گزر جاتے اُس کا ہاتھ خود بخود آئینے کی طرف بڑھ جاتا۔ اور وہ اپنے حسن جہانتاب کو آئینے میں دیکھتی۔ کچھ سوچتی اور اس کے رحصاروں کی سُرخی میں اور اضافہ ہو جاتا۔ وہ اسی کھیل میں مشغول نہی۔ کہ ایک نوجوان مردانتہ حسن کا اچھوتا شاہکار اُس کے سامنے آکھڑا ہٹو۔ وہ فرشتے میں چور تھا۔ شراب اور شباب کی بیجانی نے اُس کے حسن کو خوابوں کی بستیوں میں بنسنے والا حسن بنادیا تھا۔ اُس نے دیوار کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”لکھنے دام؟“

”جتنا کام؟“

بخت نے اپنی میخانہ بدش نظر دل سے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا  
”رات بھر کے لئے کیا لوگی میرے ہر دے کی رانی!“

نوجوان نے بخت کے لشکریں کالوں کو انگلی سے مس کرتے ہوئے کہا۔

”دوس روپے نقدا در کچھ ضرور می اخراجات آپ کو برداشت کرنا ہونگے“  
بخت نے جواب دیا۔

منظور ہے — ایک رہ بھری جوانی سے سیراب ہونے کے لئے دس روپے ادا کرنے ہوں گے — کل دس روپے — مجھے منظور ہے — کتنی اچھی ہو.....

نوجوان نے فقرہ تمام کئے بغیر پیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

بجتو کے لبوں پر مسکراہٹ کے ستارے جھیلانے لگے۔ اُس کی آنکھیں کسی نامعلوم لذت کے احساس سے بند سی ہو گئیں۔ وہ لڑکھڑا کر اٹھی، جیسے نوجوان کا تماہ نشہ اُس کی رگوں میں کھنچ آیا ہو۔ کوادر بند کئے اور بالا خانہ پر چلی گئی۔

بجتو کا حسن اب اور بھی خونخوار ہو گیا تھا۔ اُس کی جوانی زہر میں بچھے ہوئے تیر سے زیادہ خطرناک ہو گئی تھی۔ وہ دن کا زیادہ وقت آرائش میں صرف کرتی۔ اُس کی ہر شب شب عروضی اور ہر دن عشر توں کی گود میں سویا ہوا ہوتا، اُسکی سانسوں میں اب محبت کی خوبیوں میں رقص کرنے لگی تھیں۔ وہ صبح ہوتے ہی آنے والی شام کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتی۔ اُس کی نظر دل میں اب دنیا زیادہ حسین ہو گئی تھی۔ وہ ہر چیز میں اک ممھاں سی محسوس کرنے لگی تھی۔ دن غروب ہونے کے ایک گھنٹے بعد اُس کی آنکھوں کی روشنی میں کئی گناہ اضافہ ہو جاتا۔ جب نوجوان رومال سے منہ ڈھانپے اُس کے سامنے سے گزر کر بالا خانہ پر چلا جاتا۔ اور وہ دروازہ بند کر کے اُس کے پیچے پیچھے ہو لیتی۔ بوتل کھلنے کی کیف پر وہ آواز، ساغر دل کی کھنکھا اور زیندوں میں بیٹھے ہوئے قہقتوں کی صداؤں سے فضا کچھ دیزتاں معمور رہتی۔ پھر خاموشی چھا جاتی اور روشنی تاریکی کی گود میں دم توڑ دیتی۔ بجتو اب پہلی سی بجتو نہیں رہی تھی۔ اُسے اب چاندی کے مگر دل کی جہنکار سُن کر نشہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اب دنیا میں صرف ایک چیز سے محبت کرتی تھی، اور وہ تھا اُس کا محبوب۔

شب بلوع ہونے والا چاند۔ پندرہ دن اور گزر گئے۔ نوجوان ہر شب بجتو کے ہاں آتا، اور صبح چار بجے کے قریب چلا جاتا، بجتو اُس کی محبت میں کچھ اس طرح گم ہو کر رہ گئی تھی، کہ اُس نے ایک بار بھی نوجوان سے چار بجے جانے اور رات کو منہ چھپا کر

آنے کی وجہ نہ پوچھی، وہ اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا چاہتی تھی۔ کہ وہ حسین ہے اور محبت کئے جانے کیلئے بنایا گیا ہے۔

(۲)

ایک شب جبکہ بادلوں کی دلیوی بوندول کے ساز پر مہارہ الپ الپ کر کا نبات عالم کو مست و سرشار کر رہی تھی۔ وہ رات گئی تک شراب پیتے رہے۔ اور صبح جب بیدار ہوئے۔ تو دن کے دس نجح چکے تھے۔ نوجوان بھرا کر بستر سے اُٹھا۔ اور رہاں سے منہ ڈھانپ کر نیچے اُتر گیا۔ بخوبی کسی کسے سوچ یہی ڈوب گئی نوجوان کی اس بیے التفاقی نے اُسے دکھ پہنچا یا تھا۔ وہ خیال کر رہی تھی۔ کہ سلیم خلاف معمول آج بغیر پوچھے کیوں چلا گیا۔ دیکھا نشہ کے عالم میں مجھ سے کوئی غلطی تو سر زد نہیں ہو گئی۔ کیا سلیم روٹھ کر تو نہیں چلا گیا۔ وہ خدا جانے کب تک انہیں خیالات یہی غرق رہتی۔ کہ کسی آنے والے کے پاؤں کی آہستہ نے اُس کے چونکا دیا۔ اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

بخوبی مبارک ہو، آخر گھر آباد ہو ہی گیانا، یکسا بان کا ترچھا جوان ہے جہاں سے گزرتا ہے لوگ دلوں کو تھام کر رہ جاتے ہیں۔ اگر طوائف کا بھائی ہے، تو کیا ہوا، دولت اور حسن کی توفراً دانی ہے اس ایک ہی پر کیا موقوف ہے۔ ان کا تمام خاندان ہی خواصورت ہے۔ اس کی ٹبھی بہن شہنشاہ تو چکلے بھر میں اپنی مشاہ نہیں رکھتی۔ نواب صاحب دینا پور صبح ہشتم اسی کے ماں پڑے رہتے ہیں۔ خدا نے گلابی بلا کا دیا ہے۔ جب کا قی ہے تو بیجان چیزیں بھی اُدنگھنے لگتی ہیں۔

سامنے والے پواری نے کرسی پر بیٹھے ہوئے طعن تشنیع کا تکش اس پر

فالي کر دیا۔

بخاری سے لے کر پاؤں تک پہنچنے میں بھیگ گئی، اُس کے چہرے پر مُرد فی  
پھاگئی، دل سینے سے ہٹ کر وہڑ کنے لگا۔ انتہا پافل پھول گئے۔  
کیا سلیم ایک طوائف کا بھائی ہے؟ شریف! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں کیسے  
بادر کر دوں۔ کہ سلیم جیسا مخلص اور شرمیلا نوجوان اس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے نہیں  
میں یہ کبھی بھی ماننے کو تیار نہیں۔ اُس کی عادات و اطوار لپکار لپکار کر کہہ رہے ہے میں۔  
کہ وہ کسی بہت بڑے خاندان کا حیشم و چرانغ ہے۔ اور فی الحقيقة اگر وہ ایک  
طوائف کا بھائی ہے۔ تو میں کیسے زندہ رہ سکوں گی، میں بادر می کو کو نسائی دکھاؤ  
گی، کیا میری زندگی سلیکوں میں بہت کرنہ رہ جائے گی۔ کیا میں رسائیوں کے  
زاڑ پر دم توڑنے کے لئے مجبور شر ہو جاؤ گی۔ شریف! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ایک  
طوائف کیلئے ایسا ناقابل تلافی جرم کا مرکب ہونا، جیسے جی موت کے منہ میں چلنے کے مترادف ہے۔  
بخاری اپنی الحکیمی انگلیوں سے پناہی کے کھرد سے بازو کو چھوٹے ہونے کہا۔

بخاری مجھے تمہارے سر کی قسم میں غلط نہیں کہ رہا، میں نے ابھی الہبی شہزاد کے جہائی سلیم کو تمہارے  
کھر سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر لیقین نہ ہو تو میرے ساتھ چلو، میں سلیم کو شہزاد کے گھر میں لکھا دوں گا  
تمہیں بیان آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا، تم کس طرح جان سکتی ہو اگر وہ شریف ہے۔ یا  
طوائف زادہ؟

پناہی نے جواب دیا۔

بخاری کی انگلوں میں شعلے کر دیں یعنے لگے، اُس کی رگوں میں خون بجلی کی سی  
تیزی کے ساتھ حرکت کرنے لگا۔ فرط غضب سے اُس کا چہرہ شفقت آلو دھو گیا۔ اور

دہ کسی آہنی ارادے کو عملی جامد پہنانے کے لئے برقع اور دھکر نیچے اُتر گئی۔  
(۳)

نجو کی جوانی شعریت کے ساتھے میں داخل رہی تھی، اُس نے اپنا بہترین بیاس  
زیبِ نن کو رکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں ہر آپنو اے کا بیتا بی سے استقبال کر رہی تھیں۔  
کہ دُر سے سلیم آتا ہوا دکھاتی دیا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اُس کے رُگ دریشہ میں بخدا میں  
ناچنے لگیں، سلیم حسبِ معمول ردمال سے منہ چھپا نے بالاغانہ پر چلا گیا۔ وہ اُٹھی  
اور دروازہ بند کر کے اُس کے پیچے نیچے ہو لی،

”نجو! آڈ آج جی بھر کر پیں، کہ پیا جینا ہے اور جینا پیا، شراب شباب ہے  
اور شباب شراب، جوانی جب تک شراب سے متعارف نہ ہو پیری سے بدتر ہے  
اور پیری نام ہے سسکیاں لستی ہوتی موت کا۔ سانس کا بریط جب نہیں ٹوٹتا،  
اُسے دُختِ رز کی گلابی انگلیوں سے بجا تے رہو۔ اور پھر سو جاؤ، ایک طویل اور  
ذمُٹنے والی نیند۔“

سلیم نے نجو کی زگا ہوں کو اپنی آنکھوں میں پا دیتے ہوئے کہا۔

”ماں سلیم میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ آج اتنی پی جائے جس سے ہمارے  
دل آئندہ کی طرح دکھنے لگیں۔ اور ہم ایک دوسرے کا صحیح عکس اُن میں دیکھ  
سکیں۔ آڈ پیس۔“ جی کھول کر۔ ایسی جس کا نشہ عمر بھر باقی ہے۔  
نجو نے سلیم کے سامنے میز، شراب کا شیدہ اور گلاس رکھتے ہوئے کہا اور  
وہ پینے لگے۔ پینے رہے۔ خدا جانے لکھنے شیشے اُن کے حلق میں اُتر گئے  
یہاں تک کہ سلیم بالکل مددوш ہو گیا، نجو بھری ہوئی شرفی کی طرح اُٹھی، اھر سلیم

کو جھنجھوڑ کر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے یوں گویا ہوتی:-

”سلیم اب وقت آگیا ہے کہ ہم صحیح طور پر ایک دوسرے سے متعارف ہوں اور ایک دوسرے کے خدوخال دلوں کے آئینوں میں دیکھیں۔ تم جانتے ہو، ایک طوائف سے کسی طوائف زادے کا تعلق پیدا کرنا، لتنا بڑا جرم ہے۔ اور اس عرصہ کی چھوٹی سے چھوٹی سزا موت ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے، اور یہ شاید میری پہلی اور آخری محبت ہے، میں چاہتی تھتی کہ زندگی کی حیثیں اتنیں تمہاری رفاقت میں بس رہوں۔ مگر ایسا نہ ہو سکا جس کا مجھے افسوس ہے۔ تم نے میری غیرت کی شمع کو مجبت کی آندھی سے بچانا پا ہا۔ مگر وہ شعلوں میں تبدیل ہو گئی۔ کاش! تمہیں معلوم ہوتا، کہ غیرت کی گاڑی کے آہنی پہنچے محبت کے کھلاخلائے پھولوں کو اس طرح کچل دیتے ہیں۔ جس طرح سرمایہ داروں کی موڑیں مڑکوں پر پڑے ہوئے اپاہجوں کی گردؤں کو، وہ فرط غصب سے کاپنے لگی، اُس کا ماہلا انگلیا میں چھپاٹی ہوتی کسی چمکدار چیز کی طرف بڑھا، اور دوسرے لمبھے میں ایک ستم الودن بھر نوجوان کے سینے میں اتر گیا۔ ایک خوناک پیچھے فضا میں لہرائی، اور وہ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

محبت غیرت کی باندھی ہے۔ اُس سے اُس کا کہا کرن پڑتا ہے۔ انتقام۔ غیرت۔ غیرت کی چھوٹی سے چھوٹی سزا موت۔ زندہ با وغیرت بن جو اس قسم کے فقرے بڑھاتی ہوئی رات کی تاریکیوں میں غائب ہو گئی۔



# انسان نگار

محمد ایں شرف پوری



وہ افسانہ لگا رہتا۔ ادبی دنیا میں اس کی دھوم مجھی ہوتی تھی۔ آجھل لٹریچر کے اندر نقیباتی اور فتنی خوبیاں دھونڈی جاتی ہیں۔— مگر تھا کہ داس ان باتوں کا پابند نہ تھا۔ اس کے افسانے سیدھے سادھے اور سوز دگداز سے بہرنے ہوتے، وہ زندگی کے روزمرہ کے واقعات قلمبند کرتا، مخصوص طرز بیان سے چارچانہ لگا دیتا۔ جو ایک مرتبہ پڑھتا اس کا گردیدہ ہو جاتا، وہ الفاظ کے چھوٹے چھوٹے جملوں سے زندگی کے حقائق بے تقاب کرتا، پڑھنے والا مصنف یہ ساتھ کھو جاتا اور یہ محسوس کرتا کہ وہ کوئی خیالی تصویر نہیں دیکھ رہا۔ بلکہ حالات سے خود و چارہ ہو رہا ہے۔ لوگ اس کی ذہنی کاؤشوں کو ایک لطیف شغل اور دماغی شعبدہ پازی سے تعمیر کرتے مگر انہیں کیا معلوم کہ ہر افسانے کا پلاٹ اس کی اپنی زندگی کا ایک واقعہ ہے۔ اس کی زندگی حوادث سے بہرنے تھی۔!

شیما اس کے افسانوں کی روح رواں تھی، وہ اس کے تصوریں لھرایا کھویا سارہ تھا۔ شیما کا حسین و گھبیل تصور اس کی زندگی کا سب سے بڑا اور قہقہتی سرمایہ تھا۔! جب وہ مسکراتی تو وہ سمجھتی کہ آکاش کی رانی مسکرا رہی ہے۔ ستاروں کے چھرمٹ پیش چاند کی کرنوں میں۔! جب اس کی ساری ٹھیکانوں پر ڈھلک کر ہوا میں لہراتا تو معلوم ہوتا کہ تصورات کی دیوبھی اور ج فلک پر قریب قریب بن گئی ہے۔

اسنے درجنوں افسانے شیاما کے حسن کی تعریف میں لکھ دالے۔ باشیا ماکس قدصیں  
لکھی۔ جب وہ دماغ پر زدروں اتنا تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ کامات کی سب سے حسین  
تریں ذی رُوح ہے۔ دفورِ جذبات سے کانپ اُختتا تھا، آنکھوں سے انسُوبہ نکلتے  
— دل و دماغ کے پردوں میں جھپپڑی ہوئی شیاما کا غذہ پر منتقل ہو جاتی، الفاظ کا جام  
پس کر دُنیا کے لئے کھانی بن جاتی۔ ایک دلچسپ کھانی!

کسے معلوم تھا کہ یہ پیارے پیارے افسانے لکھنے والا خدا پہنچا ہی افسانہ لکھ  
رہا ہے۔ مسلم شب بیداریاں اور انہاک اُس کے جسم و جان کو گھلارہ ہے ہیں۔  
وہ ایک دن خود افسانہ بن جائے گا۔ ایک دروناک افسانہ!

دسمبر کی ایک سرد شام تھی۔ ٹھاکر داس شہر سے لوٹ کر گھر آیا۔ گاؤں  
میں ایک چھوٹی سی کوٹھری اس کا گھر تھا۔ جہاں ایک ٹولی ہوئی کھاٹ پڑی  
تھی، دو تین بین اور منی کے تیل کی ڈبیا، یہ سکا آثاثہ تھا۔ وہ ڈبیا جلا کر پیچھے گیا۔ دیئے کی کوہوا سے کھاپ  
ہی تھی۔ ٹھاکر داس قلم پا تھے میں لئے دیکھ رہا تھا۔ نہایت پچسی سے! اسنے پیچھا جیسے اس کے پیسوں  
کی دیوی شیاما آنکھوں کے آگے ناج رہی ہے۔ اہوا کا ایک تیز جھونکا آیا، ڈبیا گل  
ہو گئی۔ اکوٹھری میں تاریکی دوڑ گئی ٹھاکر داس چونک پڑا!

چھپ گئیں شیاما؛ جب ہی تاریکی چھائی ہے۔ اج چند رہاں چھپ  
جانما ہے تو دھرتی پر تاریکی کا راج ہوتا ہے۔ اکتے ہوتے اس نے ڈبیا جلا تی در واڑہ پنڈ  
کر دیا۔ ادھر لکھ رہا تھا۔ خود اپنا افسانہ۔ خود اپنی آپ بیتی۔

کہاں چھپ گئی ہو شیاما؟ نہیں بولوگی آج۔؟  
”نہیں بولوگی۔“ دُور سے آواز آئی۔

”نہیں بولوگی؟ مجھ سے نہیں بولوگی، لا الہ جی کیا پہاں بیٹھئے ہیں جو ذرہ ہی ہو، نیا ما  
آج میں بھی اُجھے پڑے پس کر آیا ہوں — ادیکھو شیا موا!“

شیا مانے لکھر کی سے جھاناک کر دیکھا۔ ماں سے آنکھ بچا کر نکل آئی —

بڑے پیٹل کے نیچے دونوں کھیل رہے تھے —

”شیا ما کیا نکل بھی کھیلوگی میرے ساتھ؟“

کیوں نہیں مٹھا کر؟ آج تو تم بڑے اچھے پڑے پہنکر آئے ہو؟“

”ماں شیا مو نہ کہتی تھیں کہ لا الہ جی بگڑتے ہیں، میرے ساتھ کھیلنے سے منع کرتے  
ہیں، آج میں نے ماں سے کہا تھا، ماں میں اچھے پڑے پس کر جاؤں گا — پھٹے  
پڑے پہنچتا ہوں، اس لئے لڑ کے میرے ساتھ نہیں کھیلتے — باکتے ہیں تو رکھنگی  
اور چارہ ہے —! بھنگی ایسے ہی کڑے تو پہنچتے ہیں پھٹے پرانے —! ماں کی  
آنکھوں میں آنسو آگئے —!

بولی: ”بیٹا اچھے لئے کہاں سے لا کر دُول — تیرا پتا نہ نہیں ہے مجھت  
مزدوری سے جو کہاتی ہوں۔ تمہارے منہ میں ڈال دیتی ہوں!“ پھر وہ بھرا کر بولی: ”جس  
کا پتا نہ نہیں ہوتا، لوگ اُسے بھنگی چارپتا تے ہیں —!“ میں نے کہا۔

”وو سلتے پہنچا د جو ہوں کے لئے رسکے ہیں —!“

”ہرث آج پس لیگا تو ہوں کے دن کہاں سے لا کر دُول گی۔“

میں روپڑا: ”نہیں ماں۔“ بسوار کر بولا: ”اچھا پس لے مگر ابھی آتار دینا —!

اچھے ہیں تاشیا مو!“

شیا مو اُسے چھپی چھپی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی —! گاڑھے کے معمولی پڑے

پہن کر شاکر کس قدر خوش تھا۔!

”پتا جی آرہے ہیں۔“ ”وہ چونک کر بولی۔ شاکر نے گھوم کر دیکھا۔“ ”کہاں؟“ ”وہ دیکھو۔“ اس نے انگلی کے اشارہ سے کہا۔

”شیما تو نہیں مانے گی؟ پھر کھیل رہی ہے اس کے ساتھ۔“ ”لامبجی چلا کر یوں لے۔“ شیما بھاگ گئی، شاکر وہیں کھڑا تھا۔

کیوں بے، نہیں مانے گا تو۔“ ”لامبجی نے شاکر کے کان لکھنچ کر کہا۔“ اب نہیں کھیلوں گا۔“ ”وہ بلیلا کر بولا۔

بھاگ جا شرپ۔“ وہ کان ملتا ہوا گھرا یا۔

”ماں!“ لامبجی نے آج میرے کان لکھنچے ہیں۔“ ”کیوں؟“

”میں شیما موکیسا تھے کھیل رہا تھا!“

”کیوں کھیل رہا تھا اس کے ساتھ؟“

دس برس کا شاکر ماں کی بات کا جواب نہ دے سکا۔

”آتار دے پڑے۔ ابھی سے میلے کر لایا۔“ ”ماں بولی۔

شاکر نے پڑے آتار دئے۔ میلی صدر می اور رکھٹی دھوتی پہن لی۔

اس دن کے بعد شیما نے شاکر کے ساتھ کھیلتا بند کر دیا۔

دن گزر رہے تھے۔ باٹھا کر سولہ برس کا ہو گیا اور شیما اچودہ برس کی۔

شاکر داں لکھتے لکھتے روک گیا۔ اقلام و انتوں تکے دبا کر سوچ رہا تھا۔ اس

کھانی کو شیا ما بھی ٹپھے گی کیا؟ شاید وہ پرچہ شیا ما کے انھوں نام پہنچ جاتے۔ اس نے پھر لکھنا شروع کیا:

چودہ برس کی شیا ما کس قدر حسین تھی؟ اس کا لمکھڑا چند دلائیں کو شرمنا تھا۔ ایشونے سارے دوسرے کا روپ اُسے دان کر دیا؛ تھا کہ اس کے حُسن کے گُن گما تھا۔ باشیا ما اب اس سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ تھا کہ پہر دل اُس کے تھوڑیں میل تک بیٹھا رہتا۔!

”ماں“ دہ ایک دن بولا۔ ”میرا بیاہ نہیں کر دگی؟“

ماں نہیں ٹپھی۔

”بیٹا تیرا بیاہ کر دل گی!“

”وکب؟“

”و جب تو کمانیکے لائق ہو جائیگا؟“

”مکس سے کر دگی؟“ ماں نے تعجب سے دیکھا۔

”جو تمہارے بھاگ میں ہو گی؟“

”و نہیں ماں! میں شیا مو سے بیاہ کروں گا۔“

”و نہیں بیٹا! شیا ما پڑے گھر کی بیٹی ہے۔۔۔ اُس کا باپ دھن دان ہے۔

”دھن دان کی بیٹی غریب کے گھر نہیں آتی۔“

”کیوں ماں؟“

”تو دان باقیں کو نہیں سمجھ سکتا!“

”ماں میں لالہ جی سے کہوں گا!“

وہ ایسی بات نہ کہنا بیٹھا! گافل سے نکال دیں گے۔!

ٹھاکرہ شش پنج میں پڑ گیا۔!

لالہ جی چوپاں میں بیٹھے حصہ پر رہے تھے۔ ٹھاکرہ ڈرتے ڈرتے ان کے پاس آیا۔!

میکیوں کیا بات ہے؟" وہ بولے

"لالہ جی۔ میں شیاما سے بیا کہہ دل گا۔؟" لالہ جی چونک پڑے۔

وہ کیا کہہ رہے ہو۔ اچھوٹا منہ بڑی بات۔ انخواب دیکھ رہے ہو گیا؟ ایسا طمانچہ دل گا کہ پتہ بھی نہیں چلے گا۔؟" لالہ جی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ ٹھاکر کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔

"معمولی پڑھے لکھے ہو۔ کہیں دس پندرہ کے ذکر ہو جاؤ گے۔" ابس

یہی ہے نامہ رائی اوقات! شیورام کی بیٹی کسی دھن دان کے گھر جائیگی۔!

ٹھاکرہ اپنا سامنہ لیکر چلا آیا۔ آج اسے معلوم ہوا کہ یہ سو داکس قدر ہے۔

ہے! آج اسے محسوس ہوا کہ غربت اور ناداری انسان کے لئے کتنی بڑی لعنت ہے!

وہیا میں ہر جیب کی آشابھی پوری نہیں ہوتی۔ اشیا مادھن دان کی بیٹی ہے۔

ٹھیک کہتی تھیں۔ ابڑے گھر میں جائیگی۔ جو اگھر جہاں سکھ اور آندہ ہو،

دولت ہو، دولت کے بغیر سکھ اور چین میسر نہیں۔ اٹھاکر جس کی ماں مزدوری

کرتی ہے۔ جس کا باپ اُسے پچھنپے ہی میں جھوڈ کر گی۔ مجلس و فلاش ہے۔

شیاما اُس کی نہیں ہو سکتی۔ ٹھاکر کی آشادوں پر پافی پھر گیا۔

خنوڑے ہی دنوں بعد شیاما کا بیاہ ہو گیا، کسی بڑے شر سے بڑے آدمی کی برات آئی۔ دھوم دھام سے شیاما کو بیاہ کر لئے گئی۔  
ٹھاکر سے شیاما پھنس گئی۔ وہ بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ بڑے گھر میں چلی گئی۔  
مگر اسے کیا معلوم کہ ٹھاکر اب بھی اس کے نام کی مالا جسپار رہا ہے۔ وہ رورا ہے  
شیاما کے پریم میں!

ماں نے کہا: ”بھیسا یوں رونے سے فائدہ؟ میں تیرا بیاہ کر دیں گی؟“

”اب بیاہ سے کیا ہو گا۔ میں بیاہ نہیں کر دیں گا ماں۔! غربوں کا بیاہ  
نہیں ہوتا۔“ ماں کا دل ٹوٹ گیا۔ ٹھاکر گھر سے غائب رہتا۔ ماں اسی غم  
میں گھُل گھُل کر مر گئی۔ ماں کے مرنے کے بعد ٹھاکر اس دنیا میں ایسا لاتھا۔ با محنت  
مزدوری سے پریٹ پال رہتا۔ مگر شیاما کی محبت اُسے گھُن کی طرح کھ  
دہی تھی۔!

رات کی تاریکی میں جب بوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے چلتے، شیاما کی یاد اس  
کے دل میں چیکیاں لیتی۔ چاندنی راتوں میں جب اُس شیاما کسی پری پریکتی  
ٹھاکر کا دل بھرا آتا۔ اُسے محسوس ہوتا جیسے شیاما اب بھی اس کے ساتھ پریتے  
کھیل رہی ہے۔ ٹھاکر کی شیاما کی چہکار کس قدر رسیل تھی۔ وہ اب تک  
نہیں بھول اُس چہکار کو۔ بھول کیونکر جاتا، شیاما اس کا جیون تھی، شیاما چلی گئی  
— مگر اس کی یاد خف کر کے دل میں موجود تھی۔ اشیام اُسے  
دُور کر دیا۔

وہ شیاما کو دل سے کیونکر دُور کرتا۔

ٹھاکر داس لکھ رہا تھا۔ انکھوں سے آنسو طپ ٹپ گر رہے تھے۔!

ٹھاکر کے دل کھی جیون کے پانچ سال اور بیت گئے۔!

ٹھاکر کے دل میں شیام کی محبت ڈرستی جا رہی تھی۔!

ایک رات اُس نے دیکھا جیسے اس کی شیام پیرتے لکھری ہے۔ اُسے بلا رہی ہے۔ وہ چونک کر رہا۔ تیرہ دنار رات کس قدر بھیانک تھی، ہوا کے سرد جھونکے چل رہے تھے۔ اشیام سکرا رہی تھی۔! ٹھاکر کو دیکھ کر چونک سی گئی۔!

«شیام میں ہوں ٹھاکر۔! بھول گئی ہو اسے کیا؟»

وہ دوڑ کر آگے بڑھا۔ مگر شیام اور دُور ہو گئی۔! بہت دُور۔ وہ بھاگا، شیام کے تعاقب میں! اُس نے دیکھا جیسے وہ ندی کے کنارے لکھری ہے۔ اس نے سُنا تھا رات کو پریاں ندی کے کنارے ناچتی ہیں۔! اشیام بھی ایک پری تھی۔ اُس کے تصورات کی! ندی گنگنارہی تھی، وہ سمجھا شیام گارہی ہے۔ محبت کے گیت! وہ کنارے پر رُک گیا۔ شیام کے گیت کتنے سندرا در من موہبت تھے۔! وہ کھو گیا میٹھے اور ریپے گیتوں کی رئے میں! ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس نے کھوئی ہوئی شیام کو پایا ہے۔! وہ شیام کے چزوں میں جھک گیا:

«شیام اب میں تمہیں کبھی نہیں جھپڑوں گا۔!»

شیام گارہی تھی وہ جھووم رہا تھا۔! شیام ناچ رہی تھی، وہ بخیو دن تھا۔! وہ تمام رات پڑا رہا، شیام کے چزوں میں اعلیٰ الصیاح لوگوں نے دیکھا! ٹھاکر ندی کے کنارے اکڑا ہوا پڑا تھا۔! اُس اسکے پھٹے کپڑوں پر جم رہی تھی، وہ خاموش

اوندھا پڑا تھا۔! اپنی شیامو کے آگے ۔!  
 داس مُک گیا۔ افسانہ ختم ہو چکا تھا۔!  
 داس نے ایک انگڑائی لی۔ چھرے پر مسترت کی امر دوڑ گئی۔ جیسے آج اس  
 کا غم غلط ہو گیا تھا۔!

ایک بیفتہ کے بعد ”چندن“ کا تازہ پرچہ شیاما کے ماتھوں میں تھا۔!  
 وہ پڑھ رہی تھی نہایت انہاں کے ساتھ۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کوئی بسری  
 باتوں کو از سرف تازد کر رہا ہے۔! جب اختمام پر پہنچی تو صحیح مار کر گر پڑھی۔!  
 ”کیا ہوا شیاما؟“ ہر شش دوڑ کر آنے۔  
 ”کچھ نہیں؟“ وہ بیٹھ گئی۔! ایک کہانی دیکھ رہی تھی۔! اُن کس قدر  
 دروناک تھی، میرا دل کا نپ رہا ہے：“  
 ”چھوڑ داں باتوں کو۔ کہاں توں پر کون اعتبار کرتا ہے۔ یہ لوگ تریوں ہی لکھتے  
 ہیں۔“ شیاما چوک پڑھی۔! ہر شش مسکراتے ہوئے چلے گئے۔  
 ”کیا ٹھاکر کو سچ مجھ شیاما سے محبت تھی۔“ لکھنے والے نے جھوٹ تونیں لکھا  
 ۔! ”دو بولی پہلو میں دل دھڑک رہا تھا۔! اُسے تیکین نہیں آتا۔“! پسیل کا پیڑ  
 شیاما اور ٹھاکر ہو بہود ہی باتیں۔! ”اس نے ذہن پر زور دالا۔“! واقعات ایک ایک  
 کر کے آنکھوں کے آگے دوڑ رہے رہتے۔!

”تھا کر مر گیا ندی کے کنا یے؟ ایشور ایسا نہ کرے۔!“ وہ لختہ لختہ کا نپ رہی تھی۔  
 تمام دن کھوئی ہوئی سی رہی۔! اس کو بھیانک خواب دیکھ رہی تھی۔!

”شیاما! ٹھاکر،“ کہتے ہوتے چونک پڑتی۔

اور داس کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے شیاما کی محبت آج پہلے سے زیادہ اُس کے دل میں پیدا ہو گئی ہے۔ وہ چونک کراؤ ٹھا۔

سرما کی سرد و تیرہ و تار رات تھی، وہ ندی کے کنارے لھڑا تھا۔ کان شیاما کے نغموں پر لگے ہوئے تھے۔

”شیاما پیاری۔“ کہتے ہوئے جھک گیا۔ ہوا کے تیز جھوٹکے چل رہے تھے شیاما نے بے چینی سے کروٹ لیکر کہا۔

”ندی کنارے مر گیا شیاما کی یاد میں۔“

”کیا ہوا شیاما؟“ ہریش کی آنکھ کھل گئی۔ چونک کرو یکھا، شیاما نبند پس ڈر ڈرا رہی تھی۔

”ٹھاکر مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔“ مجھے معاف کرو وو۔

ٹھاکر۔ ”شیاما پیچ مار کر پینگ سے گر پڑی۔

”شیاما پیاری شیاما!“ ہریش نے بھجنخواہ کر کہا۔ شیاما کے قلب کی حرکت بند ہو چکی تھی۔ ہریش دیوار سے ٹکر کر گر پڑے۔

دور دس کے بعد اخبارات میں یہ افسوسناک خبر گشت لگا رہی تھی کہ یہ مشہور انسان نے کا مسڑ داس گاؤں میں ایک ندی کے کنارے مُردہ پاتے گئے۔ ان کی موت کی وجہ اب تک معلوم نہیں ہو سکی۔ پولیس تحقیقات کر رہی ہے۔ ہریش کے ہاتھ سے پرچہ چھوٹ گیا۔



# شراب و شباب

”مرکوزہ کے سرخ جیل کے سیاسی قیدیوں  
نے اپنے زمانہ اسپری میں دیواروں پر جو کچھ  
لکھا اسے ”مسخ جیل“ کی تسمیہ کے بعد ایک  
اویب نے نئی حکومت کی اجازت سے کتابی  
صورت میں مرتب کیا۔ ”شراب و شباب“  
اس کتاب کے چند اوراق ہیں۔

(مرتب)

باری

جیل کی زندگی اپنے اندر سینکڑ دل درس لئے ہوئے ہے جیل ایک ایسا مقام ہے جہاں سماج اور قانون کے بصل قدم قدم پر تڑپتے ہوئے دکھاتی دیتے ہیں جیل کو اصلاح ادارہ بنانے کی تباہ ایک بڑی حماقت ہے جیل میں انسٹی فنی صدی اصلاح پسند مقید ہیں۔ قیدیوں کو اصلاحی تعلیم دینے سے کہیں زیادہ اس امر کی ضرورت ہے۔ کہ معاشرت میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ قیدیوں کے رہا ہونے پر بھی سماج کے یہ ناگ انہیں کاٹنے دوڑتے ہیں۔ ان سیاہ سانپوں سے نپخنے کے لئے انہیں دوبارہ جیل ہی میں جانا پڑتا ہے۔

میں ایک ایسے قیدی کو جانتا ہوں۔ جو تیس برس سے جیل میں سڑا ہے میعاد ختم کرنے پر جب کبھی اس نے شہر کا رُخ کیا تو سماج نے چور چور کہ کہ اس کا سوگت کیا۔ وہ کام کرنے کے لئے نکلا تاؤسے چور سمجھ کر کام پر نہ لگایا گیا۔ اس نے راہب نہ زندگی بسکرنا چاہی بلکن مذہب کے اجارہ دار دل نے اس کے جرم "کو معاف نیکی سماج سے انتقام لینے کے لئے وہ ہر مرتبہ چوری کرتا اور جیل بھیج دیا جاتا۔

میں کس جرم کی پاداش میں یہاں مقید ہوں؟ میں نے ایک خرد باختہ اور عدو گھبور کے اذکار کی علاویہ مخالفت کی، اور نتیجہ جانتے ہو۔۔۔ ایک سال میں ہر شام بارغ عامہ جانے کا عادی تھا۔ ایک شام میں نے مجسمہ کے قریب

چند نوجوانوں کو دیکھا جو اپنی طرح کے ایک نوجوان کی باتوں کو بغور سُن رہے تھے۔  
پاس ہی کھڑے ہو کر میں نے اس کی باتوں کو سنتا چاہا۔

”شباب۔ شراب ہے اور شراب۔ شباب، شباب نیکی ہے۔ اور اس کی ہر حرکت کا رثواب، شباب اپنے سینہ میں بے بہادولت چھپائے ہوئے ہے۔  
لکھنے نوجان میں جو اس دولت کو فیاضی سے خرچ کرتے ہیں۔ بخیل کہیں کے پیری شباب کے اس بخیل کا انتقام ہے۔ شباب کی مسرتوں سے لطف اندر دز نہ ہونا کتاب آدمیت کا ایک المذاک باب ہے۔ شباب کی کوئی گستاخی بدی کے نام سے نہیں پہکاری جاتی۔ نیزے زدیک تم سب زندگی کے مفہوم سے نا آشنا ہو۔ اور اس زمانے سے جب تمہارے عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہے گا۔ جب ردعجیت تم سے چھپیں لی جائے گی۔ جب تمہارا شباب پیری میں منتقل ہو چکا ہو گا۔ اس وقت تم لفٹ افسوس مل کر کھو گے۔“ کاش ہم جوانی کی لذتوں سے لطف اندر دز ہوتے۔“

قانون نے شباب کے سئے مسروں کے در داڑ سے کھول رکھے ہیں۔ آدمیت اسے فارم ان در داڑوں سے داخل ہو کر شراب و شباب کی نئی بستیاں آباد کریں۔ قانون نے شباب کو سرستی، کیف، شراب احریں، اور بمار دل کی آزادیاں دے رکھی ہیں۔ خائیں شباب کو ان بسیط فضاؤں میں اڑنے دیں۔ شباب کی کشتبیوں کو شراب کے سمندر دل میں بھاویں۔

فلسفہ عصیاں کے اس شاعرانہ انداز بیان کی تائید نوجوان نگاہیں کر رہی تھیں۔  
میں ان نوجوانوں کی عقل و ذہن پر مائم کر رہا تھا۔ جو ایک گراہ انسان کی باتوں کو بڑے غور سے سُن رہے تھے۔

میکوں صاحب! مجھے کچھ کرنے کی اجازت ہے کیا۔" بیس نے کہا۔

"جی ہاں۔" ایک نوجوان نے جواب دیا۔

"آپ بڑے شوق سے وعظ فرماسکتے ہیں۔" دوسرے نے کہا۔

اجماع کی خانگی حیثیت زائل ہو چکی تھی۔ ادھر ادھر سے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔

"حضرات! قانون نے شباب کو جن راستوں پر چلنے کی اجازت دے رکھی ہے وہ راستے انتہائی بر بادی پر ختم ہوتے ہیں۔ ہمیں قانون کی اس کمزودی سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے بلکہ اس قانون کو کتاب آئین سے مٹانے کے لئے کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ قانون ایک خوبصورت سانپ ہے جو شباب کی گردان میں لشکار دیا گیا ہے۔ ایک جادو ہے۔ خون گرم کو آپ سرد ہیں تبدیل کرنے کے لئے۔"

اہل فرشت حکومت سماج کی بہتری کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔ حکومت کو چاہیئے کہ شراب فروشی اور عصمت فروشی کے اڈوں کو قانوناً نامالزمان قرار دے۔"

"حکومت کے میزانیہ میں کمی دائم ہونے کا استعمال ہے۔" سامیں میں تکمیل نے کہا۔

"میزانیہ کی اس کمی کو دزیروں کی تحریک ہوں میں تخفیف سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ جن شاہدان بازاری سے "لطف انداز" ہونے کے لئے قانون کو آمد کا ر بنایا گیا۔ ان کی کیفیت کیا ہے؟ غازہ میں چھپی ہوئی مگر وہ صورتیں؛ ان کے

بیوں کی سرخی شباب کے خون سے ہے، ان کے رخسار فردوسی شباب کے لئے جہنم کے انگارے ہیں۔ ان کا طرزِ تکلم معنوی، ان کے الفاظ معنوں سے خالی۔  
**شباب** — قانونی عشرطوں کے اس دروازہ سے داخل ہو کر عصماً پیری کو تھامے ہوئے دروازہ سے باہر نکلا ہواد کھانی دیتا ہے۔

آؤ! اس دروازہ کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیں!

ان الفاظ کے ساتھ میں نے اس نوجوان کے انگار کی تردید کی۔ اگلے روز مجھ پر ”قانون شکنی“ کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا۔ عدالت نے مجھے ایک سال قید کی سزا دی۔ اگر یہ قانون شکنی ہے تو قانون سازی کس بلا کا نام ہے؟



پسپارا

آخرشیران

وہ پڑانے بھٹے کے ایک کرنے میں ایشوں کا دھیر لگا رہا تھا۔ اُس کا خفیقی نام کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ بلکہ وہ آپ بھی مدتوں سے اسے بھول چکا تھا۔ اس کے یاد دوست اسے "شخ" کہ کر پکارتے تھے۔ بنگال میں ہر ایک مسلمان کو اس نام سے پکارا جا سکتا ہے۔ چاہے وہ اس نام کے مطابق ملکی سی بھی جسمانی یا ذہنی موزوفیت نہ رکھتا ہو۔ دوسرے لوگ اسے لگڑا کہ کر یاد کرتے تھے۔ بکونکہ پین میں اس کا بایاں پیر ڈٹ گیا تھا۔ اور اس نقش کی یادگاری میں بیمارے کو تمام عمر کے لئے یہ خطاب حاصل ہو چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ چونکہ اس کی جوانی بے احتیاطی، اور بے پرواٹی میں کثی تھی۔ اس لئے اسے ایک گھناؤ فی بیماری سے پالا پڑا جس نے اس کی ناک کو بالکل غارت کر دیا۔ اور اس کی جگہ ایک ڈراڈ ناگڑھا یادگار چھوڑ گئی۔ اس کے بعد چیپ نہیں۔ اور چیپ کے گرے داغوں نے اس کی بد صورتی کو بالکل تکمیل کر دیا۔

واحد بھٹے کی طرف اپنا چھکڑا لئے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے بیلوں کو تیز پلانے کے لئے اُن کی دُم مردہی۔ اور ساتھ ہی ایک فرش سے گیت کی تان لگائی۔ مگر یہ تان جس تیزی سے پیدا ہوئی تھی، اسی تیزی سے غائب ہو گئی۔ بیل چلتے چلتے اچانک رُک گئے اور انکھیں چھپا کر اور نتھنے چھلا کر زور زور سے سانس لینے لگے۔ بیلوں کے ایک دم روکنے سے واحد اپنی

چکر سے آگے کی طرف رُڑھ کا اور بیلوں کو گالیاں دینے لگا۔ بیل کسی طرح آگے نہ بڑھے اور واحد نے اپنی پینی سنبھالی۔ وہ مارے غصے کے پاگل ہو گیا تھا۔ پینی اور پُٹھی۔ مگر اس سے پہلے کہ بیل کی لکڑی پُختی۔ وہ اپنی پوری طاقت سے چلا یا۔ سانپ رے سانپ۔

شیخ او شیخ !!

چکر سے آگے چند گز کے فاصلے پر ایک چھپٹا سا سانپ پھن اٹھائے جھوم رہا تھا واحد نے اپنے چکر سے چھلانگ لگائی۔ اور دوڑ کر ایک اینٹ اٹھالی۔ شیخ نے واحد کی آواز سنی تو تیزی سے نگڑا تما ہوا اور ساتھ چلا تما ہوا دوڑا

”ارے مارنا مت۔ مارنا مت! میں آتا ہوں ॥“

واحد نے اٹھایا ہو اباد دینیجے کر دیا۔ اور اینٹ مارنے سے رُک گیا۔

”واللہ کی قسم کیسا خوب صورت سانپ ہے؟“ واحد بولا۔ ”اور دیکھنا شیخ منزک تنا کہے سرخ زنگ کا ہے۔ اور پھن کتنا خوب صورت ہے۔ مگر یا یہ جلدی کرو۔ بھاگ رہے یہ تو“

سانپ نے خطرہ بھانپ لیا۔ اور واحد سے دُور بھاگنے لگا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ایک اور دشمن اس کی تاک میں ہے۔ اور پاس آپنے بھاگ ہے۔

”واحد ذرا اپنی پینی بھینکنا۔“ شیخ چلا یا۔ ”اوہ ہو بھٹے میں چلا گیا۔۔۔۔۔“ شیخ نے غور سے بھٹے کے اندر دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں سانپ غائب ہوا تھا۔ اسے اودے ناگ کہتے ہیں، واحد جانتے ہو۔ اودے ناگ؟!“

پھر بولا۔ یہ کو برے کی قسم کا ہوتا ہے۔ مگر بہت کم ملتا ہے۔ خدا کی قسم اگر یہ مات ہگیا تو کچھ روپے کما ہی لوں گا۔

شیخ عام پیروں سے بڑا پیرا تھا۔ یکنونکہ وہ سانپوں کا علاج معا الجہ کرنا بھی جانتا تھا۔ وہ اکثر اوقات اپنے گاؤں اور آس پاس کے دیہات میں اپنے سانپوں کی نمائش کرتا تھا۔ اور دینماقی دلپی سے تماشا دیکھنے آتے تھے۔ وہ سانپوں کو مٹی کے گھروں میں رکھتا تھا۔ جن میں سے اکثر اس کی گواں بچوں کی جھونپڑی کی چیز سے لٹکے رہتے تھے۔ چیسا کہ عام پیروں کا فاعدہ ہے شیخ بھی اپنے دشمناک قیدیوں میں سے بیکار دل اور کم زور دل کو آزاد کر دیتا تھا۔ ان میں سے بعض قید کے صد سے سے مر گئی خود رہتے تھے۔ شیخ کا یہ تجارتی سرمایہ اس کی اچھی خاصی آمدی کا ذریعہ تھا۔ اور جب تک اس کی یہ چیزیں جاگتی اور حلیتی پھر تین روپی پوری تعداد میں اس کے قبضے میں ہوتی وہ بھنوں پر بیا کیتوں میں مزدودی کرنے رہ جاتا تھا۔

ایسی حالت میں وہ ایک ٹوکری میں اپنے سانپ ڈالے ہوئے۔ اور پیروں کی توہنی منہ میں داسبے پاس ٹپڑیں کے دیہات میں لکل جاتا اور بہت کچھ کمالاتا۔ مگر اس کی یہ کمائی جلد ہی ختم ہو جاتی تھی۔ یکنونکہ وہ بھنگ اور رفیم کا عادی تھا۔ اور اس پر طریقہ کہ شراب کی چپکیاں بھی لگایتا تھا۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا کہ جوں ہی شیخ کی جمیب خالی ہوتی۔ وہ ایک پھاڑا اور ٹوکرائیں اپنے کھلتے پہنچنے پڑیں کسانوں کے دروازوں پر نظر آتا۔ اور پوچھتا ہو کر ٹیکری مزدوری؟ کوئی کام؟ ایسے لوگوں کے سامنے وہ بڑی حصت سے مسکراتا۔ اور اس کی مسکراہٹ سے اس کے بد نما چہرے پر جوشکنیں ڈپتیں وہ چھڑ کر اور زیادہ بد نما اور بیسبت ناک پنادیتیں۔ شیخ میں یہ بات خود تھی کہ وہ اپنے اس قسم کے کام لوگوں کو کبھی دھوکا نہ دیتا۔ اسے کیسا ہی سخت کام ملتا وہ بڑی محنت اور دیانتداری سے اسے انجام دیتا جس دن اسے کوئی کام نہ ملتا وہ بھیک مانگنے نکل

جاتا۔ بھیک مانگنا۔ مزدوری کرنا اور سانپوں کا تماشہ دکھانا اس کے لئے سب یکساں کام تھے۔ یہ تھوڑی بہت خیرات بھی جو اسے ملتی حسب ہول اس کے نئے پانی پر خرچ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ پچھی شراب پی آتا۔ اور جھوٹا جھامتا گھر لوٹتا۔ ایسی بدستی کی حالت میں وہ اپنی گھر دالی کے پاؤں پکڑ لیتا۔ اور شرابوں کی طرح آنسو بہانا ہوا کہتا۔ میں نے تمہیں مجھے دکھ پہنچاٹے ہیں زبیدہ۔ میں نے تمہیں فاقول مار دیا ہے۔

زبیدہ منس ویتی اور اپنے پیر چھڑاتے ہوئے کہتی۔ چھیر خانی کی باتیں نہ کر دے مجھے چھوڑ دو۔ تمہارے کھانے پینے کے لئے کچھ لاٹی ہوں۔

اس پر شیخ دھاریں مار مار کر رو دیتا اور کہتا۔ ہائے میں نے تمہارے دنے کبھی نئے گپڑے بھی تو نہیں بنوائے۔

(۴)

دوسرے دن صبح پہنچتے ہی شیخ بھٹے پر پہنچا۔ ایک چھوٹی سی قچی اور سرکندہوں کا بنا ہوا صندوق اس کے ہات میں تھا۔ مشرق کی طرف آسمان پر ایک گری سرخ روشنی کا طوفان منڈلا رہا تھا۔ گنجان و ختوں پر چڑیوں کے چندہ سہانے گیت گار ہے تھے۔ دور کسی مندر سے صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی اور دھیمی دھیمی ہوا کے چھونکے گھنٹیوں اور سنکھوں کی آوازیں لئے آرہے تھے۔

شیخ مٹی کے ڈھیر پہنچ گیا اور غور سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شفق کی سرخی دم بدم پھیلتی چاہ رہی تھی۔ اس کا پڑھتا ہوا نگ ایٹھوں کو بہت زیادہ سرخ بنارہا تھا۔ یہاں تک کہ شیخ کے میلے کچیلے پڑوں پر بھی رنگت آگئی تھی۔ یاں بیک اس نے کچھ دیکھا مادڑیہ رہا وہ کہہ کر جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

پچھوں فاسے پر کھلی جگہ میں۔ کھل دالا سانپ آسمان کی سرخی کی طرف اپنا پھن بھیلا  
خوشی سے جhom رہا تھا۔ سورج کی ابتدائی کرنوں کا اس کے نفحے سے لمبے پدن پر عکس پڑ  
رہا تھا۔ اور اس کے سرخ زمگ کو شوخ اور خوش نہابنارہا تھا۔ سرخ زمگت کے ساتھ  
اس کے پھن کی سیاہ دھاریاں زمگوں کے امتزاج کا بہت ہی سہماں سماں دکھا رہی  
تھیں۔ وہ اس وقت انساری خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ تسلی جس کے سرخ پاز دل  
پر تسلی پسلی سیاہ لکیریں ہوں۔

پسپا بھی اس کی خوش نمائی سے بہت متاثر ہوا۔ اور ہنڑوں ہی ہنڑوں میں آواہ  
لکھنے پر مجبوہ ہو گیا۔ اب وہ آہستہ آہستہ آگے پڑھا۔ سانپ سورج کی کرنوں سے کچھ اس  
دھن میں کھیل رہا تھا کہ اسے دشمن کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ نہ اس کے قدموں کی چاپ  
سنائی دی۔ وہ پستو رپنی دھن میں مگن تھا۔ مگر جب شیخ بالکل ہی قریب چاپ ہنپا۔ تو اس  
نے بھلی کی سی تیزی سے اپنا پھن لکھایا۔ اور بھینکارہماری۔ مگر شیخ کے ماہر ہنڑوں نے سانپ  
سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ پچھی سے اس کے پھن کو دبایا اور زمیں سے ملا دیا۔ اب اس نے  
سانپ کی دم پکڑ لی۔ اور اسے ڈرانے اور سدھانے کے لئے دو تین چھٹکے دیئے۔ اس کے  
بعد اس نے اپنے قیدی کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور برپڑا یا۔ یہ تو ناگن ہے۔

(۴۳)

چھ ماہ گزر چکے تھے۔ ایک دن دوپہر کے وقت شیخ چلمپی کراپنی بیوی کے پاس آیا۔  
اور بولا۔ دیکھو بیوی میں کیا چیز لایا ہوں؟

زبیدہ نے جو صحن کے اس کنارے کھڑی تھی۔ منہ پھر کر پوچھا۔ کیا چیز ہے؟  
میاں نے اپنے کپڑوں کی تہیں سے ایک چھوٹا اور جیسیں ساچھلانکا لالا اور آئے۔

دائیں اتنا کی تھیلی پر رکھ لیا۔ جب بیوی قریب پہنچی تو رولا ویکھوا،  
اس کی تھیلی پر ایک سختی سی تھنی رکھی تھی۔ زبیدہ اسے دیکھ کر بولی:-  
”اتسی جھپوٹی سی تھنی کا کیا ہو گا۔ میری ناک میں تو یہ نہیں آنے کی۔  
یشخ نے کھلکھلا کر سنتے ہوئے کہا۔ ارمی یہ تو جھوٹی بی بی کے لئے لا یا ہوں۔“  
یشخ نے ناگن کا نام ”بی بی“ رکھا تھا۔ زبیدہ نے حیران ہو کر اپنے میاں کی طرف  
دیکھا۔

یشخ ہستا ہوا کوٹھڑی میں چلا گیا۔ اور فوراً ہی ناگن کو اپنے گھے سے لپٹا ہوئے  
باہر آگیا۔ یہ وہی ناگن تھی جسے اس نے بخت سے پکڑا تھا اور چھٹے چند ماہ میں وہ کافی بڑی  
ہو گئی تھی۔ بلکہ اس کی وحشت اور دشمنی کی عادیں بھی جھوٹ گئی تھیں۔ قید نے اس کا  
جو شغوش مٹا دیا تھا۔ اس نے اپنا جھوٹا سا چوراپھن اٹھایا۔ اور پڑے چاؤ پیار سے  
یشخ کی گردان اور کندھوں کے ادھر ادھر لہرا نے لگی۔

یہ دیکھ کر یشخ کی بیوی بے چینی سے بولی۔ ایسا نہ کرو۔ مانا کہ تم نے اسے سدھایا،  
مگر موذی جانور کا کیا بھروسہ ہے؟“

”بھروسہ تو صرف زہریلے دانتوں کا نہیں ہوتا۔“ زبیدہ۔ یشخ نے اپنی بیوی کو قسمی  
دیانت کے خیال سے کہا۔ مگر یہ محنت بھی تو کرنا جانتے ہیں۔ ٹھیک ہے یا نہیں؟ اونٹی بی؟“  
کے زہریلے دانت ہیں ہی نہیں۔ دیسے دانت ضرور ہیں۔ مگر کیا اس نے آج تک مجھے  
کاٹا؟ دیکھو، کبھی میرے گھے سے لگی ہے۔ جیسے کوئی چلہنے والی عورت ہو؟“

اس نے پیار سے اپنی انگلیوں کے ساتھ ناگن کا منہ بند کیا۔ اور اسے چوہا۔ یہ زبیدہ  
کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ پہلے بھی بیسوں مرتبہ اسے ایسا کرتے دیکھ چکی تھی۔ اور

اس سے اُس کے دل کو بڑا دکھ پہنچتا تھا۔

اس نے کسی قدر زیری سے کہا۔ ”بیں نے کتنا دفعہ تمہیں سمجھایا ہے کہ اس کا منہ نہ چو ماکر و۔ مگر تم ایک نہیں سنتے غصب خدا کا۔ کوئی ایسے گندے کیڑے کا منہ بھی چو متا ہے۔“ شیخ زبیدہ کی بات سنی کر کے بولا۔ ویکھنا زبیدہ بی بی میرے گندھے کے ساتھ کس پیارے سے لپٹی ہوئی ہے۔ جب یہ سانپ ٹڑپے پیارے سے آپس میں لپٹے ہوتے ہیں اس وقت بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ تم نے بھی کبھی اُن کا یہ پیار کا لھیل دیکھا ہے؟“

اس پہنچیدہ بہت ناراض ہوئی۔ اس نے اپنا منہ ایک طرف پھیر لیا اور بولی۔ یہ پہنچنے چھپنے کی کہافی تو سنا و کسی اور کو۔ پر میں اتنا کہے دیتی ہوں کہ تمہاری موت ان ہی سانپوں کے کاٹے سے ہو گی۔ یہ تمہارا ہی پیار کا لھیل ختم کر کے نہ رکھ دیں تو میرا نام زبیدہ...“

اور زبیدہ نے منہ جو پھیرا تو کیا دیکھتی ہے۔ کہ شیخ سوٹی لئے بی بی کے نہتھے چھپدرا ہے۔ اس نے بی بی کو چھوڑ دیا۔

ناگن آزاد ہوتے ہی ٹڑپ کے گندلی کی صورت بن گئی، اس نے مارے در دار ختنے کے زور سے پھنڈ کار ماری اور دم کے سہارے کھڑی ہو کر شیخ کو کاٹنے کے لئے دار پروار کرنے لگی۔ شیخ نے اس کے خون آشام دانتوں کے چھلوں سے بچنے کے لئے بی بی والے صندوق کے ڈیکھنے کو آڑ بنا لیا۔ جو بی بی کے زور دار چھلوں سے لرز رزرا لھتا تھا۔ ”بی بی! امیری پیاری، آئنی خفامت ہو!“ اُس نے چمکارتے ہوئے کہا۔ ”خفاست ہو۔ تم یہ تھنی پہن کر بہت اچھی لگتی ہو۔“ (زبیدہ سے مخاطب ہو کر) ”زبیدہ ذرا دیبا تو آئینہ۔ ذرا بی بی کو بھی تو معلوم ہو کہ وہ کیسی خوبصورت معدوم ہوتی ہے۔“

غصتے سے جلی بھینی زبیدہ بولی "میں نہیں دیتی آئینہ و ائینہ . . . ."

"لا بھی دو فراہم بھی تو دیکھیں۔ بی بی اپنی شکل آپ دیکھ کر کیا کرتی ہے زبیدہ چارونا چار۔ آئینہ لانے کے لئے۔ دوسرا کوٹھری میں گئی۔

"اور ہاں ذرا سیندور بھی لیتی آنا۔" شیخ نے چلا کر رہا۔

جواب میں کوٹھری کے اندر سے کسی کی حیرت بھری آواز آئی۔ "سیندور کا کیا ہو گا۔"

"بی ابھی نہیں بتاؤ نگا۔" اس کے شوہر نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"تھوڑی دریکھڑرو۔ دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔"

zbیدہ نے آئینہ اور سیندور کا پیالہ لا کر رُورہ سے اپنے شوہر کے فریب سر کا دیا۔

شیخ نے چالاکی سے دوبارہ ناگن کو کپڑا لیا۔ اور اس کے پھن پر چھوٹا سا تک لگا دیا۔ جیسے ہندو لوگ شادی بیاہ کے موقعے پر دلھا دلہن کے ماتھے پر لگا دیا کرتے ہیں، تک لگا چکنے پر اس نے بڑے زور سے قہقہہ مارا اور بولا۔

"دو دیکھو زبیدہ! اب میں اور یہ میاں بیوی ہیں۔" میں نے اس سے بیاہ کر لیا ہے۔ آج سے "بی بی" میری دوسری بیوی بن گئی ہے۔

zbیدہ گونگی بیٹی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"بی بی!" اپیار میں تم کسی شندہ دکھائی دیتی ہو! اس نے آئینہ اٹھا کر اپنی نئی بیوی کے سامنے کیا۔ اور بی بی کے صندوق پر بانہہ رکھ دی اور اپنے پھٹے ہوئے دھول کے لگے سے بھرائی ہوئی آواز میں گانے لگا۔

(۲)

چند ماہ بعد کا ذکر ہے۔ برسات کا موسم تھا۔ آسمان سے ایک لگنگا طوفان بر سر ہاتھا۔ شیخ کمیں باہر گیا ہوا تھا۔ چونکہ ارد گرد کے دیہات میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ اس لئے وہ گھر نہیں لوٹ سکتا تھا۔ زبیدہ نے ایک دن اپنی کوٹھڑی میں ایک انوکھی سی خوبصورت محسوسی کی۔ خوبصورت ہونے جانے کیس چیز کی تھی۔ اور ہونے جانے کی صورتے آرہی تھی۔ مگر تھی بہت سہانی۔ اس سے پہلے کبھی اس نے اس قسم کی خوبصورت نہیں سوچ لی تھی۔ اس نے یہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن خوبصورت کماں سے آرہی ہے مگر بے مود۔ کئی دن تک یہ اس کے لئے متعابنی رہی۔

ایک ہفتے بعد شیخ گھر لوٹا۔ اس نے جی بھر کر برسات کو کو سما۔ جس نے اسے گھر سے دور رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”میرا تو مارے بھوک کے دمکل رہا ہے۔“ اس نے ایک ہی وقت میں اپنے سانس اور بد دعائیں کے ذخیرے کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ جلدی کر دیجیا پچھلانے کو دو۔“

اس نے اپنے پیروں اور پنڈلیوں سے کچھ صاف کیا۔ اور اس کی بیوی نے باسی چاول لا کر سامنے رکھ دیتے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ چاول کھانے کے لئے پالتی مار کے پہنچتے اس نے دریافت کیا۔

”یہ خوبصورتی ہے بیوی؟“

”اللہ ہی چلنے“ اس کی بیوی نے جواب دیا۔ میں آپ کچھ دن سے ہرباں ہو رہی ہوں۔ اتنا تو پتہ ہے کہ یہ خوبصورتی کوٹھڑی میں آتی ہے۔ باہر کمیں نہیں آتی۔“

شیخ کچھ نہ بولا۔ اور سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے ادھر اور ادھر منہ کر کے زور زور سے سونگھنا شروع کر دیا۔ وہ جانتا چاہتا تھا کہ یہ خوبی کیسی ہے اور کہاں سے آتی ہے۔ کوھڑی میں ادھر اور ادھر گھوستے ہوئے کیا یک دہ بی بی بی کے صندوق کے پاس پڑ گیا۔ ناگن نے اس کے قدموں کی آہٹی مٹن کر پھنس کارما رہی۔

”اچھا.....!“ شیخ کے منہ سے نکلا۔

”دکیا بات ہے؟“ زبیدہ نے فکر منیری سے دریافت کیا۔

”یہ خوبی بی بی کے بدن سے نکلتی ہے۔“

شیخ نے سنجیدہ منہ بناٹے ہوئے جواب دیا۔

”بی بی مادہ ہے۔ اور کسی نر کے لئے بے چین ہے۔ یہ اس کے گرمائے کا موسم ہے زبیدہ۔ اور جب کوئی ناگن گرماتی ہے تو ہر ان کی کستوری کی طرح اس کے بدن سے خوبی نکلتی ہے۔ یہ خوبی ایک طرح کی پکاریاً آواز ہے۔ کسی نر کو بلا نے کے لئے“  
zbیدہ کا منہ کھلا کا کھلا اور آنکھیں ہپٹی کی ہپٹی رہ گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ بتائیں اس کے لئے جہراں کن بلکہ پرشیان کن ہیں۔ آخر دہ بولی:-

”لو آؤ، اب چاول کھاؤ۔ مجھے ان باتوں سے کیا مطلب؟“

”بی بی کو چھوڑے دیتا ہوں ہیں۔“ شیخ نے چاول کھاتے ہوئے جواب دیا۔ اس حال میں اسے بندہ کھنا بڑا ہی پاپ ہو گا۔ اس کی بات ایک ٹھنڈے سافس پر ختم ہو گئی۔

zbیدہ نے بھی ایک لمبا سافس لیا۔ مگر یہ سافس اطمینان کا تھا۔ کتنے لگتے؟ اس کا چلا جانا ہی اچھا ہے۔ مجھے یہ گھنوفی کیڑے اچھے نہیں لگتے؟

شیخ چاول کھا چکا تو اس نے "بی بی" کو صندوق سے باہر نکالا۔ اور اپنی انجلیوں سے اس کا پھین پکڑ کر چمکارنے لگا۔

دفعتاً زبیدہ کو باد آیا کہ مدت سے ناگن کے زبردیے دانت نہیں چھیلے گئے۔ اور اب پھر وہ بڑھ گئے ہوں گے۔ وہ گھبرا کر کتنے لگی۔ جلدی کرد۔ اسے جانے دو۔ میں کہتی ہوں۔ اب روکومت۔ چھوڑ د جلدی سے۔"

"بی بی کو مجھ سے پیار ہو گیا ہے۔ دیکھو کس چاؤ سے وہ میرے کندھ سے لگی ہوئی ہے۔" شیخ نے ٹھنڈا سافس بھرتے ہوئے کہا۔

سماں پر کامنگڑہ حکیم اپنے جھونپڑے کے ایک انڈہیرے کو نے میں غمگین بیٹھا تھا۔ وہ بی بی، کو قریب کے جنگلوں میں چھوڑ آیا تھا۔ زبیدہ نے اسے غور سے دیکھا اور ہمدردی سے بولی۔ "اُساں کیوں بیٹھے ہو داں تمانگر پی لونا۔ یا لیٹ ہی رہو۔

شیخ نے گھنٹوں سے سراٹھایا اور جواب دیا۔ اس کے نہ ہونے نے مجھے ہڑا دکھ پہنچایا ہے زبیدہ۔"

"اللہ اللہ کرد۔ زبیدہ منس کر بولی۔"

کیا وہ کوئی عورت تھی؟ بولتے کیوں نہیں عورت تھی کیا وہ؟"

"نہیں بیوی۔ مگر مجھے پھر بھی صدمہ ہے ।"

زبیدہ اپنے میاں کے پاس بیٹھ گئی۔ اور اپنے بازوں کے گلے میں ڈال کر پیار سے بولی۔ کیوں جی کیا تمیں مجھ سے پیار نہیں؟"

شیخ نے اس کے گال پر منہ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ تم تو اپنے جیوڑے کا پین ہو۔"

نه پیرے جن زہر پیٹے سماں پر کوپاتھے ہیں۔ ان کے دانتوں کو باقاعدہ تراشتے رہتے ہیں۔ اور یہ بھی ان کے پیٹے کا ایک فرض ہے۔

یک بیک زبیدہ کا پدن کانپ اٹھا اور وہ چلائی۔ دیکھو بی آگئی بی بی ملٹ کر آگئی۔ وہ دیکھو۔ وہ موری کے اندر۔

ناگن سچ مج دیوار کے پاس موری کے اوھرا دھر گھوم رہی تھی۔

۱۰ سے پکڑتا ہوں۔ شیخ نے کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مگر زبیدہ نے اپنی پوری طاقت سے اسے پھر بٹھا دیا۔ اور چلائی۔ نہیں نہیں۔

پھر اس نے غصے سے سانپ کی طرف رُخ کر کے کہا۔ چلی جایہاں سے گندی کمیں کی۔ وہ انتہائی غصے سے کھڑی ہوئی۔ اور ایک چھوٹا سا پھر انھا کر زدہ سے ناگن کے مارا۔ یہ چوت ناگن کے انتہائی غمیظ و غصب کا باعث ہوئی اور وہ فوراً اچھل کر بار بار زمین پر چکن مانے اور کامنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ موری میں واپس چلی گئی۔ اسی دن آڈھی رات کو زبیدہ نے اپنے سوئے ہوئے شوہر کو جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ اور بڑی دہشت کے ساتھ کامیتی ہوئی جیخ مار کر بولی۔ اٹھو ہائے اٹھو! مجھے کسی چیز نے کاٹ لیا ہے۔

شیخ نے جلدی سے چراغ جلایا۔ زبیدہ کے دائیں بازو پر ایک چھوٹا سا خون کا قطرہ روشنی میں چمک رہا تھا۔

”بی بی“ تمہاری پیاری بی بی نے مجھے کاما ہے۔ ”zbیدہ دوبارہ چلائی توہ دیکھو وہ رہی چھنال، مال زادی۔“

zbیدہ کے مرنے کے بعد شیخ نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ اور دوسری ایک چھوٹی سی جھونپسی بناؤ کر رہنے لگا۔ اس کا پرانا گھر اب سانپوں کا مسکن تھا۔ جو سب کے سب اورے ناگ قبیلے کے سانپ تھے۔

یا بالفاظ دیگر بی بی اور اس کی اولاد نے اس گھر پر قبضہ کر لیا تھا۔  
ہر روز سورج کے طلوع ہونے پر اس کی زرد، زرد ناچحتی ہوئی شاعروں کے  
ساتھ اس گھر میں بیسوں چھپتے پڑے قرفی رنگ کے سانپ جھوستے اور لمرتے  
نظر آتے تھے ۔ ۔ ۔

بات یہ تھی شخ نے زبیدہ کا استقامہ لینے کے لئے "بی بی" کو مارا نہیں اور صرف  
یہ کہہ کر چھوڑ دیا ۔ ۔ ۔

"یہیں تمہیں الزام نہیں دیتا" بی بی "اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ۔ ۔ ۔  
عورت ذات میں حسد کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے ۔ ۔ ۔  
اور سوتیاڈاہ تو مشہور ہے۔ زبیدہ تم سے جلتی تھی۔ پھر تم کیوں نہ اس سے  
جلتیں؟ سو کن کس کو پیاری لگتی ہے ۔ ۔ ۔"



# غائب اور گھٹے

حاجی لقمان



مجھ سے رواتت کیا کامری باری علیگ نے اور انہوں نے سن اپنے دوست  
مرزا کاظم سے اور مرزا کاظم نے سُنافی آپ میرے الفاظ میں۔ اور اس کا ثواب  
پہنچا ہے۔ غالب اور گوئے کی ارداح کو اور دعا کیجئے میرے حق میں۔ اور واللہ  
اعلم بالصواب!

مرزا کاظم جن دنوں برلن میں تھے۔ ان آیام کا ذکر ہے۔ کہ مرزا صاحب  
کی ملاقات ایک پنجابی سکھ پرتم سنگھ سے ہوئی۔ اور دنوں چار روز تک ایک  
قبوہ خانہ میں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ایک روز سردار جی نے مرزا صاحب  
سے کہا۔ کہ بھائی صاحب! بات یہ ہے کہ میں اٹلی بانا چاہتا ہوں۔ اور میرے  
پاس پیسہ کوئی نہیں۔ اٹلی میں میرا مستقبل بہت شاندار ہو سکتا ہے۔ اس لئے اگر  
آپ کچھ روپیہ بطور قرض مجھے دے دیں۔ یا کسی دوست سے دلا دیں۔ تو میں  
اٹلی پنج کرخوارے ہی عرصہ میں قرض چکا دوں گا۔

مرزا کاظم نے ایک لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا۔ قرض؟ سردار صاحب! یہاں  
پر دیس میں کون ایسا ہندوستانی فارغ الیال ہو سکتا ہے۔ جو اپنے اللہ تملوں  
کے علاوہ کسی دوست کو قرض دے سکے۔

سردار جی۔ مجھے کچھ زیادہ روپیہ نہیں چاہئی۔ صرف.....

**مرزا صاحب۔** (بات کاٹ کر) اجی کم زیادہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ کسی سے ایسی درخواست کرنا ہی بے معنی چیز ہے۔

**سردار جی۔** (ما یوسی کے لمحہ میں) تو پھر کیا کیا جائے؟

**مرزا صاحب۔** کیا کیا جائے؟ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

**سردار جی۔** (پڑا میڈنگا ہوں سے دیکھتے ہوئے) وہ کیا۔ وہ کیا؟

**مرزا صاحب۔** وہ یہ کہ ہندوستانیوں کی بجائے جزوں سے رد پیر حاصل کیا جائے۔ وہ بہت آسان کام ہے۔

**سردار جی۔** وہ کیسے؟

**مرزا صاحب۔** یہیں کل بتاؤں گا۔ آپ اسی وقت یہاں تشریف لے آئیے۔

**سردار جی کی آنکھیں** ان الفاظ کو مُنْ کر چمک آئیں۔ اور آپ مرزا صاحب کا پیشگی شکریہ ادا کر کے خصت ہوئے۔

رات پھر سردار جی کو نہیں دہ آئی۔ اور دوسرے دن وقت مقررہ سے پہلے ہی قبوہ خانہ میں پہنچ گئے۔ اور بے صبری کیسا تھا مرزا کاظم کا انتظار کرنے لگے۔ آخر مرزا آئے۔ اور چائے کی پیالی پہنچتے ہوئے یوں گویا ہوئے۔

**مرزا صاحب۔** دیکھئے سردار جی! مرزا غالبہ ہندوستان کے بہت بڑے شا

تھے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے۔

**سردار جی۔** وہی نہ ہجھیں انڈین شیکسپیر کہتے ہیں؟

**مرزا صاحب۔** (مسکراتے ہوئے) نہیں، نہیں، نہیں انڈین شیکسپیر تو آف شر کا شہیری تھے جو مشہور درامہ نویس تھے۔ غالبہ ان سے بہت پہلے عمدہ مغلیہ

میں گزرے ہیں۔ آپ کا نام اسداللہ خاں تھا۔ اور وطن دہلی، آپ فارسی اور اُرد و دو نوں زبانوں کے بہت بڑے شاعر تھے۔ لیکن عمر تنگدستی میں گزری۔ آپ کو شراب نوشی کا بہت شوق تھا۔ اس لئے کبھی فاسخ البابی نصیب نہ ہوئی۔

**سردار جی۔** میرے پچاہ نہایت منگوکی طرح، ذیلدار تھا، و دسویں بھروسہ میں لختی فتح بحر میں عزت بھتی۔ لیکن شراب نے پڑا غرق کر دیا۔ آج اسے کوئی دس روپے اُدھار نہیں دیتا۔

**مرزا صاحب۔** ماں، ماں، بس غائب کی بھی یہی حالت تھی، لیکن تھا بڑا نودار مرتا مر گیا، لیکن اُمرا کے سامنے نہ جھکا، اس کی ایک خوبی یہ تھی۔ کہ ... سردار جی سر تو ملا تے جاتے تھے، لیکن دل میں سوچتے تھے۔ کہ بات توجہ منوں سے روپیہ حاصل کرنے کی تھی۔ یہ مرزا صاحب غائب کا قصہ کیوں چھپ رہی ہے۔ آپ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے۔ کہ مرزا کاظم نے ان کے دل کی بات کو بجا شپ کر دیا تھے سے اشارہ کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ خاموشی سے سُنْتے جائیے۔

**مرزا صاحب۔** غائب ایک فلاسفہ شاعر تھے۔ اور انہوں نے دہی زمانہ پا یا۔ جو جرمنی کے شاعر گوئٹے کو نصیب ہوا۔ گوئے میں بھی ...

**مرزا صاحب۔** ماں تک کہہ پائے تھے۔ کہ سردار جی سے صبر نہ ہو سکا۔ اور انہوں نے بات کاٹ کر اپنی بات شروع کر دی۔

**سردار جی۔** لیکن مرزا صاحب! جنم میں چائیں غائب اور گوئٹے، آپ نے دعده کیا تھا۔ کہ آپ جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی ترکیب بتائیں گے۔

**مرزا صاحب۔** بالکل درست، اور میں وہی ترکیب تو بتا رہا ہوں۔ آپ فرا

ستے جلیئے۔ آپ ہندوستان کے بہت بڑے مورخ، ادیب اور شاعر ہیں۔  
سردار جی۔ میں اور شاعر؟

مرزا صاحب۔ میں آپ چھپ رہیئے۔ اور میری بات سنئے۔ آپ اتوار کے  
دن "ہومبرگ ہال" میں ایک تقریر کریں گے جس میں آپ غالب اور گوئے  
کی شاعری کا موازنہ کریں گے۔

سردار جی۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں تمہری زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا  
اور تم غالب اور گوئے کی شاعری سے واقع ہوں۔

مرزا صاحب۔ آپ اردو زبان میں اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے۔ تو پنجابی زبان میں  
تقریر فرمائیے۔ بات صرف یہ ہے کہ بولتے جلیئے۔ غالب اور گوئے کی شاعری  
سے آپ واقع نہیں۔ تو ان کے نام ترجمہ ان مشکل نہیں۔ ذرا کئے تو

سردار جی۔ غالب گوئے، غالب گوئے

مرزا صاحب۔ بالکل ٹھیک، آپ پاس ہو گئے۔ صرف اتنی بات ہے کہ غالب  
انڈ گوئے کئے۔ امگر زیریں زبان میں جسے ہم اپنڈ کہتے ہیں۔ جرمیں میں اسے انڈ  
کہا جاتا ہے۔

سردار جی۔ غالب انڈ گوئے، غالب انڈ گوئے۔

مرزا صاحب۔ داہ، دا خوب، اب آپ ہندوستان کے بہت بڑے سکالر  
ہیں۔ بل بیان کے اخبارات میں اعلان شائع ہو گا۔ کہ ہندوستان کے مشہور  
سکالر سردار پر یقیناً اتوار کے دن پوچت شام ہومبرگ ہال میں غالب  
اور گوئے کے موضوع پر ایک زبردست تقریر کریں گے۔ داخلہ ملک

کے ذریعے ہو گا۔ وغیرہ

سردار بھی۔ لیکن میں تقریر میں کسی گا کیا؟

مرزا صاحب۔ جو بھی میں آئے رکھتے جائیے

اقوار کی شام آپ سنبھلی۔ ہو برگ ہال جرسن "اہل ذوق" سے کھچا کچھ بھر گیا۔ صدر اور کرسی پر برلن کے مشہور ماہر ادبیات جلوہ افزودتے ہان کے ایک طرف سردار پرستیم سنگھ اور دوسرا طرف مرزا کاظم بیٹھے تھے۔ تقریر کا وقت آگیا اور سردار صاحب تقریر کرنے کے لئے اٹھے۔ صاحب صدر نے اٹھ کر حاضرین سے پرو فیسر پرستیم سنگھ کا تعارف کرایا۔ جس پر ہال خیر مقدم کی تالیوں سے گونج اٹھا۔ سردار صاحب نے اپنی تقریر شروع۔

صاحبان! مرزا اسد الشد خاں غالب و ہلی کے رہنے والے تھے مارڈ و اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ شراب بہت پیتا تھے۔ اس نے ان کی عمر تنگستی میں گزری۔ ہلی ہندوستان کا دار السلطنت ہے۔ وہاں ایک لگنڈہ لھر بھی ہے۔ چاندنی چوک میں سو دایپنے والوں کی صدائیں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ ہر طرف آوازیں آتی ہیں۔ غالب، اندھگوئے!

مجمع نے پُر زور تالیاں آسمان سر پاؤٹھا۔ اور جب تالیوں کی گونج ختم ہوئی۔ تو سردار صاحب نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

ہلی سے تین سو سیل کے فاصلے پر لامہ ہو رہے۔ میں قصلع لاہور کا رہنے والا ہوں ہمارا علاقہ ٹریانہ نہیں ہے۔ پچھلے سال باشیں کم ہوئی تھیں۔ اسی نے فصلیں اچھی نہ ہوئیں۔ اس سال گور و ہمارا جگ کی کرپا ہے۔ نہیں بھی پانی خوب نہ۔ اور باشیں بھی

اچھی ہو گئیں۔ اُمید ہے کہ گیوں کی فصل اچھی رہے گی۔ لاہور کی بہت سی چیزوں پر مجھے کے قابل ہیں۔ مثلاً بادشاہی مسجد، جہارخیت شکھ کی سماں وہ اچھیاں گھر، عجائب گھر۔ غالب انڈ گوٹے۔

پھر تایپوں سے خدا گرنج اٹھی۔ اور صاحبِ صدر کے بیوی پر قسمِ رقص کرنے لگا۔ آپ نے میر پا تھمار مار کر مقبرہ کی "جادو سیانی" کی داد دی، سردار صاحب نے اپنی حوصلہ افزائی ہوتی دیکھی۔ تو ذرا بلند آواز سے تقریر کرنے لگے۔ فرمایا۔

غالب انڈ گوٹے کی قسمتی تھی۔ کہ انہوں نے شری دربار صاحب امرتسر کے دریشن نہ کئے۔ حتیٰ کہ وہ ضلع گور دا سپور بھی نہ جاسکے۔ درنہ دہان کا گڑھ کر انہیں ناف سینے میں یاد آ جاتی۔ ضلع امرتسر میں ایک گاؤں چمپاری ہے۔ دہان کے خربوزے بہت مشہور ہیں۔ قصور کی عیتی بہت مشور ہے۔ اور پھر غالب انڈ گوٹے کے کیا ہی کہنے ہیں۔ گویا انڈ یا انڈ جو منی۔

اس دفعہ سردار نے استاوے کے بتائے ہوئے سبق "غالب انڈ گوٹے" پر "انڈ یا انڈ جو منی" کا اضافہ کر کے بھال ہی کر دیا۔ اور ان الفاظ نے سونے پر ساگے کا کام کیا۔ تایپوں سے ہال گرنج اٹھا۔ سردار صاحب نے تقریر بجارتی رکھی۔ اور تین فقرے کہنے کے بعد فرمایا۔ کہ صاحبان اب غالب کے اشعار بھی سنئے۔

اس مقام پر اٹھ کر مرزا کاظم نے حاضرین سے جمن زبان میں کہا کہ پر فیض پر قسمِ شکھ اب غالب کے چند اشعار سنائیں گے۔ سردار صاحب نے اپنی مخصوص قومی لے میں یہ گانا شروع کر دیا۔  
اساں نت دے شرائی رہناں فی ہر نام کو لے نا رے

ادھر پڑھ کنڈھ کر کے

مرزا کاظم کئی سے اچھل پڑے۔ جس پر سمیعین نے تالیوں سے فضایں  
گونج پیدا کر دی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سب نے ان اشعار کو بیچ پسند کیا ہے  
سردار صاحب پھر پوئے۔

فی اسیں مر گئے کمایاں کر دے فی ہر نام کو رے نارے  
ابھے تیرے پندرہ بنے — ہائے فی اسیں مر گئے  
اس و فھر حسب معمول کافی داد ملی۔ لیکن داد کی حد تو اُس وقت ہوئی۔ جب  
سردار صاحب نے غالباً کی دہ مشت "ستائی" جس کا ثیپ کا مصروعہ یہ بتا د  
موڑیں بابا دانگ والیں چھٹیں

ڈیڑھ گھنٹہ گز رکھیا۔ اور سردار پر تیم سنگھ موڑخ، شاعر اور ماہر ادبیات کی تقریب  
ختم ہوئی۔ اس کے بعد مرزا کاظم اٹھئے۔ اور انہوں نے نہامت فصح جسم زبان میں  
بیان کیا۔ کہ پروفیسر نے جس قابلیت سے غالباً اور گئے کا موازنہ کیا ہے۔ شاید  
ہی آجتک کسی نے کیا ہو۔ کہ اکہ بملن میں تو ایسی تقریب آجتک نہیں ہوئی ہوگی۔  
اویس مجھے فخر ہے۔ کہ میرے ملک نے پروفیسر صاحب جیسے باکمال آدمی پیدا کئے ہیں  
میں اس پوری تقریب کا ترجیب برلن کے اخبارات میں شائع کراؤں گا۔ اور آپ  
دیکھیں گے۔ کہ میرے دشمن کے مایہ ناز ماہر ادبیات نے علم و فضل کے کیا کیا دیا ہے  
ہیں۔ میں آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ آپ نے پروفیسر صاحب کے  
خیالات سُنتے کی تخلیق گوارا فرمائی۔

اس کے بعد صاحب صدر اٹھئے۔ اور انہوں نے پروفیسر صاحب اور

مرزا کاظم کا شکریہ پبلک کی طرف سے ادا کیا۔ اور جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا۔ پھر کیا تھا بڑے بڑے ادیب، اخبار نویس اور تیس سردار صاحب سے مصافحہ کرنے کو پلکے۔ اور آپ کو بڑی مشکل سے ہال کے در دانہ تک لیجا گیا۔ اسی رات کو مرزا کاظم پر فیسر پر قیم سنگھ کو ٹرین پر سوار کرانے کے لئے اسٹیشن تک لے گئے۔ اور دنوں کی چیزیں نوٹول سے پُر تیس۔

# بڑا بھائی

رامانند ساگر کا شمیری

یہ افسانہ آں انڈیا ریڈپوس سے نشر کیا جا چکا ہے۔ اور  
ڈائرکٹر آں انڈیا ریڈپوس کی اجازت سے شائع کیا جا رہا ہے۔

چاندنی رات کیا تھی گویا ایک ساتھ خاموشی پسند جس نے ایک عالم کو چاندنی کی شراب سے نلا دیا تھا۔ کائنات کا سر زرہ خاموش تھا۔ گواہی آغاز شب تھا۔ لیکن چاندنی میں پیٹھی ہوئی رات کے تیور کچپڑا یے مدھوش کرن تھے۔ کہ کوئی بھی ہوش میں نہ رہ سکا۔ سب بہوشی کی نیند سو گئے۔

گرمی کا موسم۔ شر کے اس حصے میں۔ جسے غریبوں کی بستی کہتے ہیں۔ تمام گھنی کوچے چار پاؤں سے پہ پڑے ہیں۔ پرانی طرز کے ایک دلمپوں کی مدھم روشنی میں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکا آہستہ آہستہ پل رہا ہے۔ بہاس پوسیدہ چہرہ بے رونق۔ لیکن چال ڈھال قدرے شاعرانہ۔ وہ ایک جھونپڑی نما مکان کے سامنے ٹھہر گیا۔ ایک چار پانی خالی پیٹھی۔ ساتھ والی چار پانی پر دو پنجے سورہے تھے۔ سات سالہ بیٹھنی اور دس سال کا مرادی۔ دونوں کو میہمی نیند کی گود میں دیکھ کر اس کے بے رونق چپڑے پر مسکراہٹ کا ایک پھیکا ساختہ کھج گیا۔ گویا ایک اکیلا ستارہ چمپکا اور اس کی روشنی آسمان کی مہیب و معنوں میں کھو گئی۔

لڑکا آہستہ سے چار پانی پر دراز ہو گیا۔

اس کی نگاہیں آسمان کے تاروں میں چک گئیں۔ کیا جانے دہ کیا ویکھتا رہ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دہ فوراً اکٹھ بیٹھا۔ جلدی سے ہمچھیں لوٹ پڑے۔

لیں۔ اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اس کے آنسو کسی نے نہیں دیتے۔ وہ پھر پیٹ گیا۔ لیکن وہ سونہ رکا۔ جب جب وہ آنکھیں بند کرتا۔ تو بھوکی آتیں پیٹ میں کلپنا نے لگتیں۔ اس نے دودن کے بھوکے پیٹ کو بتیرا بھانے کی کوشش کی۔ کہ جب چھوٹے بھائی اور بیٹنے کھایا۔ تو سمجھو میں نے ہی کھایا۔ لیکن پیٹ کا دل ہتھڑا ہی ہوتا ہے۔ جو وہ ہری شنکر کے چند باتیں محسوس کرتا۔ بھوکا پیٹ براخخیا چلا تارا۔ بالآخر وہ مجبور ہو کر آہستہ سے در دازہ کھول کر مکان میں داخل ہو گیا۔ اندھیرے میں اس نے ہندڑیا مٹولی۔ وہ بالکل خالی تھی۔ ہری شنکر کا دل عینچھا گیا۔ اس نے پیٹ کو احتسابے فراہیل لیکن بھوکا شیرک انتا ہے۔ ہری شنکر کیلئے اب ایک ہی چارہ تھا۔ کہ وہ زور سے چلا نے۔ جب انسان کا کوئی غنخوارہ ہو۔ تو ایسے ہی موقع پر اس کو تسلیم دینے کے لئے قدرت نے کئی بے بہ موتیوں کو آنسو بن کر پیکنے کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

وہ رویا ہی چاہتا تھا۔ کہ کئی سال پیشتر کا ایک واقعہ اس کی آنکھوں میں پھر گی۔ جب موت نے اس کی بیوہ ماں کا دامن تھاما ہوا تھا۔ اور وہ ٹوٹی ہوئی آفاز میں وس گیا۔ سالہ ہری شنکر کو سمجھا رہی تھی۔ کہ یہ چھوٹے بیٹنے اور بھائی اب تمہارے آہرے ہیں۔ دیکھنا بیٹھا۔ اب ان کی ماں نہ ہو گی۔ جو ان کا لامن پامن برداشت کرے گی۔ اب ان کے ساتھ ماں کا لاڈ، اور باپ کا پیار تمہیں نے کرتا ہے۔ دیکھنا۔ ماں باپ کی کمی محسوس کر کے یہ نئے پودے کیسی مر جانہ جائیں۔ اور اگر ان کو کچھ ہو گیا تو پھر تمہاری ماں نہ ہو گی۔ جو تمہارے لئے اور بھائی جن سکے۔ بیٹھا دنیا میں سب کچھ مل سکتا ہے۔ لیکن ماں کا پیٹ نہیں ملتا۔ یہ بھی جانتی ہوں۔ کہ تم خود ابھی نئے ہو۔ خود تمہیں کس کے حوالے... یہاں اگر ماں کچھ پڑی تھی۔ آخر میں اس نے جلتے جاتے بھن آتا

کھاتھا ہے بھگوان تمیں یوڑھوں ختنی عقل دے ۔ ماں کی دعا فاتی نہ گئی ۔ اس کے ان افاظ نے ہری شنکر کی جوانی چھپیں لی ۔ وہ بچپن سے سیدھا بڑھا پے میں داخل ہو گیا ۔ اس میں شباب کی شوخیاں ظاہری نہ ہو پائیں ۔ اس کسی ہی میں بچپن کی شوٹی یا جوانی، اب یہی پن کے بجائے اس میں بزرگوں کی سی متاثر اور سنجیدگی آگئی تھی ۔ اسے اپنے بڑا بھائی ہے ۔ ہونے کا بہت احساس تھا ۔ ماں کی باتیں اس کی لوح دل پر کندہ ہو چکی تھیں ۔ ماں کی آخری خواہش برلانہ ہی اس نے اپنا ایمان بنارکھا تھا ۔ اس نے اپنی تمام تر خواہشات، اپنے تمام جدید باتیں اور بلوں کے چھوٹے بھائی اور بہن کے چاؤچوں خیلوں پر بچھا در کر دیا ۔ ان کو پہلے کھلاتا خود بعد میں کھانا پڑھانے پڑھ آج دور دز سے وہ اسی لئے بہت رات گئی گھر لوٹتا تھا ۔ یکوں نکر وہ جانتا تھا کہ گھر میں شخص و ذمکوں ہی کے کھانے کے لئے کافی خوارک ہے ۔ چنانچہ جب وہ انتہا سے تھاک کر خود کھانا کھا کر سورت ہتے ۔ تب یہ گھر آتا ۔ تاکہ انہیں معلوم نہ ہو کہ بڑے بھائی نے کھانا نہیں کھایا ۔ لیکن آج اس کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی ۔ وہ چلا تا چاہتا تھا کہ ماں کے آخری الفاظ ذا اس کے کانوں میں اس دور سے گوئی نہیں کر کلپیلاستے پیٹ کی جنخ دیکھا رہا ہے میں گم ہو گئی ۔ جو دل ماخوں سے نکلا پڑتا تھا ۔ اس نے پھر ڈھارس ہاندھی ۔ اس نے پانی کا ایک گلاس بھر کر پنی لیا ۔ پھر دسر اور پھر تیسرا لمحی ۔ اور چار پانی پر لیٹ گیا ۔

دفعہ کسی خیال سے چونک کر وہ پھر اٹھ بیٹھا ہے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپیہ فکالا ۔ یہ اس کا آخری آماٹہ تھا ۔ ماں مرتے وقت چاندی کے دو چار زیور چھپوڑی تھی جو ایک ایک کر کے تمام پک گئے تھے ۔ ایک آخری کڑا جو نیچ گیا تھا ۔ ہری شنکر آج اسے بھی نیچ آیا تھا ۔ دوسرا روز دسہرے کا تیوہار تھا ۔ اور وہ پہ برداشت نہ کر سکتا تھا ۔ کہ

"بڑے بھائی کے ہوتے ہوئے ماری اولیٰ دسرے پھول کو مٹھائی کھاتے اور کھونے لاتے دیکھ کر دل مسوس ہیں۔ اس کے سامنے مخفی ایک مقصد تھا۔ کہ ان دونوں کو کسی طرح ماں کی کمی محسوس نہ ہو۔ اُسے آشدہ کی فکر نہ تھی۔ اس وقت اُسے یہ خیال نہ آیا۔ کہ یہ روپیہ حتم ہو جانے کے بعد۔ . . . پھر کیا کھائیں گے۔ اُسے اپنا فرض پوڑا کرنا تھا۔ اور وہ یہ سمجھتا تھا۔ کہ ان پھول کو ردی چھیا کرنا کسی بالائی طاقت کا فرض ہے۔

ہوا بھی ایسا ہی۔ انہی دونوں ہری شنکر کو کسی ریس کے ہاں ملازمت مل گئی۔ اس کے چار سالہ پچھے کو کھلانے کی۔ اب اس کی قدرے آرام سے کئے لگی تھے اک نجیانے کی کوئی بنتی کی جوانی عود کر آئی۔ بنتی کی انکھوں میں معصومیت کی جگہ حیانے لے لی۔ وہ اب گھر سے باہر نہ مل سکتی۔ ایک روز ایک امیرزادے نے ہری شنکر کو راہ چلتے ہوئے ملا۔ اور کہنے لگا۔ "بنتی کو صبح ہمارے گھر بھج دینا۔" "کچھ تعجب اور کچھ گھبرہٹ کے عالم میں ہری شنکر کے منہ سے نکل گیا۔" تمہارے گھر؟ آخر کیوں؟" امیرزادہ بولا۔" ماں کہتی تھیں کہ چوکہ برتن کر جایا کریں۔ ارے بھائی۔ تمہاری کچھ تھوڑی سر دہو جائے گی۔"

جیسے کسی نے ہری شنکر کے دل پر گھونسالا را۔ اس نے امیرزادے کی انکھوں میں ایک برق اگیں چنگاری چکتی دیکھی۔ اس چنگاری نے اس کے سینے میں آگ پھونک دی۔ ایک ملہ کے لئے وہ یہ بھول گیا۔ کہ دو مفلس ہے۔ اور کہ یہ بے غریباں اس کو دراثت میں ملی ہیں۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ "بنتی۔ اور میرے ہوتے ہوئے لوگوں کے جھوٹے برتن صاف کرے۔" رہ رہ کر اس امیرزادے کی انکھوں کے نفسانی شرارے ہری شنکر کی رگوں میں آگ جھوٹکتے رہے تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ اس وقت ہری شنکر کے ماحتوں کی انہ تھکیوں نکر نہ ہوا۔ البتہ وہ کسی طرح موقعہ مال کر چلا گیا۔ کاش یہ امیر لوگ کسی غریب

بڑے بھائی کے سینے میں اتھڑاں کر اس کے دل کو ٹوپول سکتے۔ اس داقعہ کے بعد ایک اور غم نے ہری شنکر کا دامن تھامیا۔ اب تر دن بشنی کی شادی کی فسکیں رہنے لگا۔

مرادی بھی اب کام کرنے کے لائق ہو گیا تھا۔ یہیں وہ کرتا دھرتا کچھ نہ تھا۔ بلکہ یوں کہو کہ ”بڑے بھائی“ کی لامتہ محبت نے اس کو بگاڑ دیا۔ عادات و خصلات میں وہ اپنے بھائی کی ضمیر تھا۔ اسے بُری صحبت لگ پکی تھی۔ کئی مرتبہ بستی کے لوگوں نے بلکہ خود بشنی نے بھی مرادی کی شرایق توں اور زیادتیوں کی شکایت کی۔ ہر مرتبہ ہری شنکر ان لوگوں کو یہ کہتا یہ بھئی یہی سمجھا دوں گا۔ یہیں جب مرادی اس کے سامنے ہوتا۔ تو نجاتے دل کے کس کونے سے محبت و شفقت کا ایک چشمہ ہپوٹ پڑتا۔ جو اپنی رو میں تمام شکوئے شکایات بھائے جاتا۔ ہری شنکر کا گلابنڈ ہو جاتا۔ اور وہ مخفی اتنا کرپاتا۔ کہ جھپوٹے بھائی کو اپنی آنکھیں بیٹھیں گے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی اس میں سکت ہی نہ باقی رہتی۔ ایسے موقعوں پر کئی مرتبہ ہری شنکر کی آنکھوں میں ایک آدھ آنسو بھی چمپک آئتا۔ ان باتوں سے مرادی اور بگڑ گیا۔

ایک روز ہری شنکر خوش خوش گھروٹا۔ وہ تمام دن بشنی اور مرادی کو ایک خوشخبری سنانے کے لئے بیتاب رہا تھا۔ جھپٹی ملتے ہی وہ بھاگم بھاگ گھرا یا۔ تمام راہ وہ بشنی کی شادی کا تصور باندھتا آیا۔ آج اس نے بشنی کی شادی ملے کر دی تھی۔ انہیں مستر انگلیز خیالات میں خلطان جب وہ گھر پہنچا۔ تو اس نے بشنی کو چشم بر راہ پایا۔ وہ درداز کی آڑ میں سے اسی کارۂ نک رہی تھی۔ اندر آتے ہی اس نے اس کا دامن تھامیا۔ اس کی آنکھوں میں ددموٹے موٹے آنسو لختے۔ جو مخفی ہری شنکر کی آمد کے منتظر تھے

اس کے آتے ہی وہ بھی بُشی کے دل کی مانند قرار کھو کر چھوٹ پڑے۔ ہری شنکر نے فرطِ استعجاب میں پوچھا: "بُشی کیوں؟" بُشی نے کہا: "ماردی....." اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ البتہ کلمہ پُورا کرنے کے لئے آنسو انکھوں سے نکل آتے۔ ہری شنکر نے مضر طربہ ہو کر پوچھا: "کہاں ہے ماردی....." بُشی نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بخلی کی مانند اندر گیا۔ ماردی اوندو ہے منہ پڑا تھا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی ہری شنکر کو سارا معاملہ سوچھ گیا۔ آخر دبھی ہٹا جس کا اندر ٹیکھا۔ ماردی آج شراب پی آیا تھا۔ یہ اس کی بُردی صحبت کا حامل تھا۔ ہری شنکر کا چہرہ یکبارہ گی متمناً اٹھا۔ اس نے کہا۔

اسی طرح پڑا رہنے دے۔ اسے پانی تک بھی نہ پوچھ۔ لیکن نجاںے کیوں وہ خود اس پر عمل نہ کر سکا۔ بجھی وہ بھائی کا سر سہلا تا۔ اور کبھی تلوے۔ اسی طرح اس نے تمام رات انکھوں ہی میں کاش دی۔ آخر پڑا بھائی "تھا نا۔

اس واقعہ کے بعد ماردی اور کھل کھیلا۔ یہ واقعہ اسی قسم کے مسلسل واقعات کا آغاز ثابت ہوا۔ حتیٰ کہ ماردی کا شراب پینا مسلم ہو گیا۔ بھائی کی تمام کوششوں کا نتیجہ گر کچھ نہ ہوا تو یہ کہ ماردی نے شراب کے ساتھ ساتھ جو بھی شروع کر دیا۔ اور جو شے کالاز مہینی عیار می بھی اس میں پدرجہ اتمم موجود ہوئی۔ ہری شنکر ان ہاتھوں کو دیکھتا۔ تو خون کے گھونٹ پتیا۔ اس نے ماردی کو سدھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن مرض پڑتا گیا جوں جوں دوا کی۔ بیت میں پانی نے انٹ کرنا تھا نہ کیا۔

ہری شنکر نے کسی دل کسی طرح بُشی کا بھارا ٹارنے کا بندوں بست کیا۔ سرال جاتے وقت بُشی نے انکھوں میں آنسو بھر کر بھائی سے کہا: بھیبا۔ ماردی کا کیا بنیگا؟ ہری شنکر نے اسے ڈھارس بندھلتے ہوئے کہا۔

”اس کا کیوں فکر کرتی ہوئیں۔ وہ سدھا ہی جائیگا۔ اور پھر اس کا بڑا بھائی جو موجود ہے۔ جب تک میں ہوں۔ تم دونوں کیوں فکر کر دو۔  
ہری شنکر کے سر پر جو سب سے بھاری بوچھہ تھا۔ وہ بیشی کے سسرال چلے جانے پر بیکا ہو گیا۔ اب رہ گئیں مرادی کی اوپاشیاں اور ہری شنکر۔

ایک ضروری امر کا ذکر تو رہا ہی جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ زمانہ کی ستم خلیفیوں نے ہری شنکر کی شوخی چھین کر اسے سمجھیدہ و متنیں بنادیا تھا۔ لیکن اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کہ وہ نوجوان تھا۔ اور ایک شاعراً دل رکھتا تھا۔ اور ایک شاعر کے دل پر جو گزر دکرتی ہے وہ اس پر بھی بیت چکی تھی۔ اس کا دل بھی کسی کی زلفوں کے پیچ میں کھو گیا تھا۔ وہ بھی کسی کے رُخ پر نشار ہو چکا تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ واقعات کے اُدھ پھیرنے اس کے عشق میں سرگرمی نہ پیدا ہونے دی تھی۔ اور نہ ابھی تک اسکی پُوہی پھیل پائی۔ لیکن اس ظاہری بے رنگی نے اندر وہ طور پر اسکی محبت کو اس قدر گھرے رنگ سے داغ دیا تھا۔ کہ جیسے سینکڑوں ہزاروں طوفانوں کا پانی بھی دھونہ سکے۔ وہ دن کے وقت دکھائی دینے والے آسمان کی مانند تھا جس کے سینے میں سینکڑوں ارماں کا داغ ستاروں کی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر نظر نہیں ٹپتے۔ اس کی انتہا محبت پر سمجھیگی کچھ اس طرح پر وہ کئے ہوئے تھی۔ جس طرح کسی گھرے سمندر کی فاموش سطح جس کے پردے میں ہزاروں لمبی متناویں کی مانند اُندر ہی ہوتی ہیں جس کے دل میں کئی پُر شور طوفان اُنٹتے ہیں۔ اور دل ہی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن سطح پر ایک لا بدی سکون ظاہر ہوتا ہے۔

غوغیکہ اسے چمپا سے عشق تھا۔ اور آپ جانتے ہیں۔ کہ ایک سمجھیدہ شخص کا

کس قدر بخوبی ہوتا ہے۔ چمپا ایک غریب گھسیارے کی لڑکی۔ شر سے باہر ایک جھونپڑے میں رہتی تھی۔ جہاں ہری شنکر ہر روز اپنے نئے مالک کو گاڑی میں بٹھا کر ہوا خوری کے لئے جاتا۔ اس نے چمپا سے شادی کی ہوتی۔ لیکن آج تک بڑے بھائی "کافر" چمپا اور اسکی شادی میں مانع تھا۔ یہونکہ وہ خوس کرتا تھا۔ کہ بھائی کی شادی کا مقدس فرض پورا کئے بغیر وہ شادی کا حق نہیں رکھتا۔

لیکن اب اس نے چمپا کے ساتھ اپنے دامن کی گردہ باندھنے کی بات طے کر لی۔ اس کے لئے کسی خاص تیاری کی ضرورت نہ تھی۔ دنوں کے چماں پر یہم کی ولدت کے سوا کچھ نہ تھا۔

جوں جوں مقررہ روز نزدیک تر ہوتا جا رہا تھا۔ ہری شنکر کے تصور کے ساتھ نئی نئی دنیا میں ہسپتی جا رہی تھیں۔ کئی مرتبہ وہ آئندہ زندگی کے تخیل میں کھو جاتا۔ چمپا کا خیال ایک نشہ تھا۔ چور فہر رفتہ اس پر چھا گیا۔ لیکن واقعات کے ایک ہی چکر نے اس کی شراب میں نک گھول دیا۔

ایک روز اس نے مارہی اور اس کے او باش دوستوں کو باتیں کرتے سنا۔ وہ لوگ اُسے بھڑکا رہے تھے۔ اور ہری شنکر کے کاؤن میں مارہی کے یہ الفاظ پڑے، "ااا۔ بھائی کو میری کیا فکر۔ اُسے تو اپنی شادی کی دھن سمارہ ہی ہے۔ میری ماں ہوتی تو کوئی میرا بھی خیال رکھتا۔ یہ الفاظ سن لیتے کے بعد ہری شنکر کی حالت یعنیہ اس خرمن کی مانند تھی۔ جس پر ابھی ابھی سمجھی گری ہو۔ وہ اس ہرفی کی مانند ترمپ اُٹھا۔ جس کے پچھے کوشکاری کے تیرنے سے موت کا سندھیش سنایا ہو۔ اس روز وہ ماں کی تصوری کے سامنے دل گھول کر رویا۔ اس نے پاک پاک کریا سے کہا۔ "تم بتاؤ

ماری۔ میں کس دن مراری کا خیال دل سے بھلا لیا۔ کس دن اس کو کھلانے سے پہلے خود کھایا۔ میں نے اس کو فرد بھر تک دست سے بچانے کے لئے اپنے سر پر پہاڑ نہ لکھا۔ کیا میں نے اس کے تمام ناز برداشت نہ کئے۔ کیا میں نے اس کے دل کو کوئی ٹیس پہنچنے دی۔ کیا میں نے وہ کچھ نہ کیا۔ جو شاید تم بھی نہ کر سکتیں۔ تب۔ تب کیوں اس نے ایسا کہا۔ ... ماں! تم نے مجھے بڑا بھائی کیوں بنایا۔ ماں کی تصویر نے نجات ہری شنکر کیا کہا۔ البته کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا۔ کہ ہری شنکر کی شادی بیکنگٹ کیوں رک گئی۔ اب ہری شنکر کا سینہ ایک خاموش آگ تھا جس کی ارمانوں کی لہیں نہیں اٹھتیں۔

اب ہری شنکر مراری کے لئے کسی رٹکی کی تلاش میں تھا۔ انہی دنوں ایک اور واقعہ ایسا ہوا جس نے بساط ہری رٹ دی۔ اس نے لٹتا۔ کہ مراری اب کہتا ہے۔ کہ وہ اسی رٹکی سے شادی کر لیگا۔ کہ جو ہری شنکرنے اپنے لئے تلاش کی ہے۔ ہری شنکر کی برداشت کی حد ہو گئی۔ اس کا رشتہ صبر اس قدر نہ گیا۔ کہ اب اس میں بچپک کی مطاق گنجائش نہ رہ گئی۔ اس نے مراری کو سمجھایا۔ لیکن جہاں تک سمجھو بوجھ کا جادو چلتا ہے مراری تو ان عدد کو پار کر چکا تھا۔ حتیٰ کہ ہری شنکرنے بھائی کے پاؤں پڑھ لئے۔ اور انکھوں میں آنسو لا کر ایک عاجز گداگر کی مانند بھیک مانگی۔ مراری میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ تم مجھ سے میری جان لے لو۔ لیکن یہ سلطانہ کر د۔" مراری یہ جان نہ سکا۔ کہ بھائی نے اس ایک فقرہ میں اپنی محبت۔ رشتہ برادرانہ اور پھر سب سے بڑھ کر اپنی زندگی کا سلطہ ڈالا ہے۔ آخر دہ سمجھتا بھی کیونکر۔ قدرت نے اُسے بڑا بھائی نہ بنایا تھا۔ اس نے ناپاہیدا نفس کی غاطر اس نے کو رد کر دیا۔ کہ جس کا پہہ پہشتگی رکھتوں پر بھی بھاری ہے۔ اس نے

”بڑے بھائی کی محبت کو ٹھوکر مار دی۔

مرادی کی خدمت دیکھ کر ہری شنکر نے خیال کیا۔ شاندخت افاظ سے کام نکل آئے۔ چنانچہ وہ اُسے جھوڑ کر جھپٹ کر کسی کام کو چلا گیا۔ واپس لوٹا تو ایک جھوٹے سے لڑکے نے اُسے بتایا۔ کہ آج مرادی بھیتیا نے بہت شراب پی ہے۔ اور ایک پاؤ لے کر یہ کہتا ہوا کہیں چلا گیا ہے۔ کہ ”اگر وہ مجھے نہیں دیتا۔ تو میں اس کے لئے بھی نہ چھوڑ دیں گا؟ ہری شنکر کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے سوچا کہ نشے میں بدست مرادی سے پچھلھی بعید نہیں۔ اس میں کھڑا ہنے کی سکت نہ رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود نیچانے کس طرح وہ ہوا کے پر لگا کر بجا گا۔ راہ میں وہ دل کو ڈھاریں بندھانا گیا۔ کہ مرادی پچھلھی ہو۔ آخر میرا بھائی ہے۔ وہ اتنا کبھی نہیں کر سکتا۔ چمپا کے چھوپڑے کے قریب پینچ کراس کے پاؤں میں من کے ہو گئے۔ اس کا دل طوفان زدہ کشی کی مانند چکو لے کھانے لگا۔ وہ چھوپڑے میں داخل ہی ہونے لگا۔ کہ مرادی باہر نکلا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر دنوں ٹھٹک گئے۔ مرادی کی نیچی نگاہوں سے ہری شنکر سمجھ گیا۔ کہ جونہ ہونا تھا وہ ہو گیا۔ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ ندی کے طوفان زدہ کتارے کی مانند وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کے دل پر جوبیت رہی تھی۔ اس کو بیان کرنے کا نہ قلم کو یاد رہے اور نہ اس کا صحیح اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ سمجھ لیجئے۔ کہ ایک ایسا شکار تھا۔ جس کے سینے کو کئی شکاریوں کے چھوڑے ہوئے تیروں نے ایک ساتھ لگ کر شق کیا ہوا۔ اور اس پرستم یہ کہ اس کی جان ٹمک گئی ہو۔

ادھر مرادی کی یہ حالت تھی۔ کہ قتل جیسا خوفناک جرم کرنے کے بعد اس کا تمام نشہ ہرنہ دچکا تھا۔ یہ فطرت کا تقاضا تھا۔ کہ اس وقت اس کے دل میں وہ خستہ

جد بات سرا نہار ہے تھے۔ کہ جن کو بیدار کرنے کے لئے بڑے بھائی نے اپنی تمام طاقت لگا دی تھی۔ لیکن یہ اس وقت ہوا جب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ہری شنکر نے مخفی انہیں کیا۔ کہ مرادی کو ماں کی تصوریہ کے سامنے رکھ لے گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس چوتھے نے ہری شنکر کے جذبہ احساس کو سُن کر دیا تھا۔ اسکی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھے۔ نہ لب پر آہ۔ ہری شنکر نے ماں سے صرف آنا کہا۔ تم نے دیکھا۔ ماں۔ مرادی نے کیا کیا۔ اب یہ امانت مجھ سے نہیں سنبھالی جاتی۔ اسے تمہیں واپس سونپتا ہوں۔ مجھے بڑے بھائی کے فرائض سے بسلک دش کر دو۔ ان دو مختصر فقرتوں نے مرادی کی آنکھوں کے سامنے بھائی کی محبت کا وہ باب کھول دیا جس کا خاتمه نہ تھا۔ اس کے دل نے اس پر ہٹکار ڈالی۔ اس نے چاہا کہ ایک بار پھر ہری شنکر کا طرح محبت بھرے الفاظ ہیں اسے سمجھائے لیکن وقت بیت چکا تھا۔

ہری شنکر نے عدالت میں خود خونی ہونے کا اقرار کیا۔ مرادی کا ضعیفہ برداشت ذکر سکا۔ اس نے بھی عدالت کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ کہ ہری شنکر نہیں۔ وہ خونی ہے۔ عدالت عجیب مخصوصے میں ہنسپر گئی۔ فیصلہ ننانے میں کئی روز لگ کئے۔ عدالت کوشش کرنے پر بھی کوئی فیصلہ نہ کر پائی۔ دونوں بھائی کسی خوفناک گمراہی والے سمندر کی مانند سنجیدہ رکھتے۔ دونوں کے دلوں میں کیا جانے کیا کیا زیر وزیر پر ہور رہا تھا۔ ایک روز موقعہ ملا۔ تو ہری شنکر کھلا۔ اس نے چھوٹے بھائی سے کہا۔ ”مرادی۔ آخر قم مجھ سے کیسا چاہتے ہو۔ مجھے تباہ کیوں نہیں ہونے دیتے؟“ مرادی برداشت ذکر سکا۔ وہ بھائی کے قدموں میں گر گیا۔ اور روتا ہوا کہنے لگا۔ ”میرا کنہا بخش دو۔ بھتیا!“ اس سے زیادہ وہ پکھونہ کہہ سکا۔ بھائی کے اٹکھدا نے نہ امت کو دیکھ کر بڑے بھائی کا ضبط بھی ٹوٹ گیا۔ وہ ایک

رکے ہوئے ناٹے کی مانند ہو نکلا۔ ردتے روتے اس نے بھائی کو اٹھا کر گھے سے لگایا اسے جی بھر کے پیار کیا۔ اور بولا: "شاپاش۔ تم سے ایسی ہی امید تھی۔ کیا آج بھی تم بڑے بھائی" کی ایک درخواست قبول نہ کر دی گئے۔ مراری بولا: "درخواست نہیں۔ بھائی۔ تم حکم کر د۔ تمہارا ہر لفظ میرے لئے قانون ہے؛ ہری شنکر نے آبستگی سے جواب دیا۔" تم مجھے مر جانے دو۔ مراری کا دم تک رُک گیا۔ بڑا بھائی کہتا گیا: "ماری۔ آج پہلی مرتبہ بڑے بھائی" کی درخواست کو منتظر کر د۔ اب مجھے ادراز یادہ تکلیف نہ دو۔ صونج خون میرے سر سے گز رچکی ہے۔ اب مجھ میں زندگی کا بوجھ برداشت کرنے کی سکت باقی نہیں میرے چھوٹوڑ دینے کے بعد اب میری کشی ہیات کو طوفان میں نہ دھکیلو۔ اس کے لئے ڈوب جانے ہی میں لاحت ہے۔ میں تم سے زندگی بھر کی محبت کے صلے میں صرف سوت کی بھیک مانگتا ہوں۔ مراری جانتا تھا۔ کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنے جھوپڑے کو آگ لگا رہا ہے۔ اپنے ہی تیر سے اپنا سینہ چھپید رہا ہے۔ لیکن آج وہ اس مرحلے پر پہنچ چکا تھا۔ کہ "چماں بڑے بھائی" کے حکم سے سول ما فرما فی کرنے کی مطلقاً گنجائش نہ رہ گئی تھی۔ اس نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ بڑے بھائی کی خواہش پوری کر کے اسکی زندگی بھر کی محبت کا صلم چکا دیا۔ اور بھی ایک خیال کہ اس کا "چھوٹا بھائی" آخر کار فرمانبردار نکلا۔ بھانسی کے نجتے پر بھی بڑے بھائی کو قسمی دے رہا تھا۔



بِصُول

آخر انصاری

اُس نے کتاب ہاتھ سے رکھی اور موڑھے پر بیٹھے پیٹھے زور سے انگڑائی۔ جب انگڑائی لینے کے بعد جسم پنی صلی حالت پر ہاگیا تو ماخوذ بڑھ کر چارپائی پر سے گھری اٹھائی۔ اور وقت دیکھا۔ گھری میں فیروزہ بجا تھا، حالانکہ شام ہو چکی تھی اور ساہنے سورج غرباً ہوا تھا۔ وہ گھری کو اپنے کان کے پاس لے گیا۔ بیک بیک کی آواز بند تھی۔ اُس نے گھری کو انگلیوں میں دبا کر ہلا کیا اور دس پانچ جھنٹے دئے۔ سیکنڈ کی سوتی کو غور سے دیکھا لیکن وہ اپنی جگہ پر قائم تھی۔ ایک فتحہ پھر زور سے ہلا کیا اور جھٹکے دئے۔ اور کان کے پاس لے گیا۔ وہ اب بھی خاموش تھی۔ اُس کے چہرے پر تلنگی اور جھنجھلاہست کی ایک کیفیت پیدا ہوئی جس کا انظہار اگر انداز میں کیا جاتا تو یوں ہوتا۔ — بند ہو گئی کم بخت بالعنت ہواں پر!

اُس نے ناخن سے گھری کو کھوایا۔ جامد و ساکت پُر زدن کو لمبہ بھر دیکھتا رہا۔ پھر انگلی سے بال کمانی کو ہلا کیا۔ پُر زدن نے تھوڑی دیر تک جنبش کی، اور پھر بے جان ہو کر روک گئے۔ اب جو کیفیت اُس کے چہرے پر ظاہر ہوئی اُس کا مطلب یہ تھا۔ نامراہ! ملعون! جی چاہتا ہے جسے زمین پُر زور سے پٹخ دوں۔ اور جوستس سے رکڑ کر پیس ڈالوں۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ ڈھکنے کو بند کر کے گھری کوبے پر دائی کے ساتھ چارپائی پر ڈال دیا۔

اس پر افسردگی طاری ہو گئی۔ ایسی افسردگی جو کسی بڑے نقصان یا کسی شدید محدودی کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ ”ابھی دو ہمینے ہوئے اس کی صفائی کرانی لھتی“ اس نے اپنے دل میں کہا، ”اور بارہ آنے خروج کئے تھے۔ معلوم نہیں حرامزادہ صفائی کرتا بھی ہے یا نہیں۔ گزشتہ دو تین سال میں کتنی دفعہ صفائی کراچکا ہوں۔ اب اُس کے پاس ے جاؤں گا تو دھڑکے کہ دیگا۔ یہ گھڑی میلی ہو گئی ہے صاحب! صفائی چاہتی ہے تیری ہی کی تیسی! بد معاش کمیں کامیے ایمانی کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔ گھڑی نہ ہوئی فذاب ہو گیا۔ ایک سو ماہی ٹیکس اور میوپلٹی کابل آیا ہوا ہے۔ لاڈس ٹیکس ادا کرنے ہے یہ ٹیکس ہیں تر کے میں ملا ہے۔ خوب چیز تھے ہمارے والد صاحب بھی! نہ چھوڑ مرے لاکھ دو لاکھ روپیہ ہمارے لئے جو آج ہم چین کی فسی بجا تے اور ذکری کے جھنپھڑوں سے آزاد ہوتے۔ چھوڑ کر مرے بھی تو کیا چیز؟ گیارہ روپے سالانہ ٹیکس؛ سال بیسال ادا کئے جاؤ ارے یار کیوں ناشکری کرتا ہے؟ اتنا بڑا مکان رہنے کو ملا ہوا ہے۔ بالکل مفت ہیں! اور ٹیکس کارونا رد تا ہے۔ چھپی! کیا مکان ہے؟ کھنڈر اور دیرانے سے پدر تر۔ اس کے مکان کستے ہیں؟ یہ تو تکیہ ہے، فقیر کا تکیہ! اسادھوؤں کا استھان! دھونی رہائے پڑے رہوں گریتی ہوئی دیواروں کو ہمی ہوتی نظر دیں سے دیکھا کر د۔ اور ٹیکس ادا کئے جاؤ۔ کیا تھی آخری تاریخ اُس کی ادائیگی؟ تاریخ تو کبھی کی نخل چکی ہو گی۔ آج تک کبھی تاریخ پر ادا ہی نہیں ہوا۔ جب قرقی کا دارث آتا ہے تو ادا ہوتا ہے۔ اب کے بھی یہی ہو گا۔ قرقی کا دارث آئے گا تو بھاگا بھاگا پھر دیں گا۔ آفریکا سے لااؤں گا گیارہ بارہ روپے؟“ اس نے سر ایسہ ہو کر چاروں طرف ایک نظر ڈالی۔ سامنے چار پائی پر گھڑی پڑی ہوتی لھتی۔ لعنت ہے اس گھڑی پر۔ پھرے چھاؤں گا گھڑی سارے کے پاس اور بارہ آئے

اُس کی نذر کر دل گا کیسی ناکارہ گھڑی ہے کم بخت! رسول روپے کی خریدی اور دو تین  
برس میں کہتے ہی رہوپے اور پرسے کھائی۔ کیا فائدہ ایسی گھڑی رکھنے سے ہیں میں  
بڑی بُجُوك ہوتی تم سے۔ وہ والد کی صیبی گھڑی تم کو اپنے ہی پاس رکھنی چاہئے تھی کیا  
حرج تھا اگر وہ صیبی تھی؟ تم زنجیر نہ ڈالتے یونہی حبیب میں پُری رہا کرتی۔ اور آج تک تو  
بہت سے لوگ رستِ واج کو بھی حبیب میں ہی رکھا کرتے ہیں۔ کلامی پر باندھنے کا شیش  
تو کچھ پڑانا سا ہو گیا۔ مگر تم نے تو صیبی گھڑی کا استعمال فیشن کے خلاف سمجھا، اور اتنی لایو جو گھڑی اُنھا کہ اس کو دھے کو دے دی۔ ایسے نالائی بھائی بھی کام کے باجی چاہتا ہے  
پکڑ کے کھال اور ٹیروں۔ مارتے مارتے ادھ موکر ڈول! معلوم نہیں بازار میں حاکر  
یعنی آیا یا سچ مجھ چوری ہو گئی۔ اگر مجھے خبر ہوتی کہ اس کا یہ شر ہونے والا ہے تو کم بخت  
کو یعنی ڈالتا۔ ڈیڑھ سور و پے کی چیز تھی۔ کچھ نہ ملتے پر بھی ستراستی روپے مل جاتے۔ اتنی  
بڑی رقم سے میرے کہتے کام نکلتے! بر سوں سے ایک بائیکل خریدنے کا ارادہ کر رہوں  
بائیکل ہی خرید لیتا۔ یہ جو صبح شامِ مشکوں پر گھستتا پھرنا ہوں اس سے تو نجات ملتی معلوم  
نہیں کس مرد دنے چڑائی! اگر پتہ لگ جائے تو سور کے نیچے کو قید کر لائے بغیر نہ چھوڑ دیں۔  
مگر یارِ تم تو اس فلسفے کے قابل ہو کہ آدمی بُجُوك سے تنگ ہے اگر اور ضرورت سے پہنچوڑ ہو کر  
چوری کرتا ہے۔ اگر سب کی ضرورتیں حسبِ لخواہ پُری ہوتی رہیں اور سماجِ مفہدوں اور  
ناہاروں کے وجود سے پاک ہو تو چوری اور ڈکھتی کی دار داتیں بھی نہ ہوں۔ لوگ بے  
ایمانی اور غافلگاری اسی لئے کرتے ہیں کہ اس کے سوا کچھ اور کرنیں سکتے۔ پھر جب تمہاری  
چینی چوری ہوتی ہے تو کیوں بھانتے ہو اور کیوں دانت پیں پیں کر چوڑ کو گالیاں دیتے ہو؟  
کسی ضرورت مند نے ہی تمہاری گھڑی چڑائی ہو گی۔ نہیں جی یہ استدلال صحیح نہیں ہے

ہمارا فلسفہ اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے اور اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اُچکے اور اٹھائیں لیجئے ہماری چیزیں چڑھائے جایا کریں اور ہماری پیشانی پر بیل نہ پڑے۔ آخر کیون ان افسوس ہو سمجھیں اتنی عمدہ گھری کے چوری ہو جانے کا؟ اور سارا قصور تو اس نامعقول ظفر کا ہے جو انہیا سے زیادہ بیجے پر وادا قع ہوا ہے۔ سارے دن واہی تباہی مارا پھرنا ہے۔ نہ لکھنے پڑھنے کا ہوش ہے نہ اپنے مستقبل کا فکر اسخ کیا کریں گے یہ دنیا میں ہائی اسکول ہی پاس نہیں ہوتا۔ دو سال سے فیل ہو رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم نے بھی کبھی محنت کے علاقوں نہیں پڑھا۔ مگر ہماری بات دوسری تھی۔ والد زندہ رہتے اور مال و دولت کی فراہمی تھی۔ ہر طرح کا عیش و آرام ممیا تھا۔ نہ کسی چیز کی کمی تھی نہ کسی بات کا غم۔ اگر ہم نے تعلیم پر پوری توجہ صرف نہیں کی تو وہ ایک قدر تی بات تھی۔ مگر انکے حالات تو بہت مختلف ہیں۔ ان کو تو زیادہ ہوش مندی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ اور پھر دو سال فیل ہونے کے کیا معنی؟ ہم تو کبھی فیل نہیں ہوئے۔ چو تھی جماحدت میں جو داخل ہوئے تو آخر تک پاس رہتے ہی چلے گئے۔ میں سال کی عمر میں یہی لے کر لیا۔ اور وہ دو سال بیماری میں ضائع نہ ہوتے تو اٹھا رہ سال کی عمر میں ہی بی لے کر لیتے ہیں۔ اے! بی۔ لے! بی۔ لے! کیا خضول رہ لگا رکھی ہے؟ کون ساتیر مارا ہے تم نہیں۔ لے پاس کر کے؟ اٹھیں اُر پے پانچ آنے تھواہ ملتی ہے۔ اگر کمل بکال وٹے جاؤ تو جھوکے مرد نہ مزدوری کر سکو نہ بھیک مانگ سکو۔ خود کشی کرتے ہی بی بی پڑے۔ تو اس میں میرا کیا تصور ہے میں نے قوبی۔ لے پاس کیا نا؟ کاش والد ایک دو سال اور زندہ رہتے اور میں ان کے سامنے بی۔ لے کر لیتا! اس ساری تباہی اور بر بادی سے نجح جاتا۔ نہ فلم جرنلزم کے چکر میں ٹرپتا۔ نہ بیشی جاگر اپنادقت اور رد پیغ بر با دکرتا۔ نہ وہ اخبار نکالنے کی حماقت سر زد ہوتی۔

نہ دستوں کو اس طرح لوٹ مار کرنے کا موقع ملتا۔ بس یہی۔ اے کرتے ہی وہ کوئی آپسی ملازمت دلوادیتے۔ پہنچا بھیں نائب تھیصلدار کرا دینا اُن کے لئے کوئی بات ہی نہ تھی۔ آج مزے سے کہیں تھیصلدار یا دُپٹی کلکٹر ہوتے۔ بلکہ نائب تھیصلدار ہی تو ہائی اسکول کے بعد ہی مل سہی تھی۔ لیکن داٹلی صاحب نے کہا، ابھی یہ لوڑ کا بہت ز عمر ہے، اس کو پڑھنے دیجئے۔ اور ایک نائب تھیصلدار ہی پر ہی کیا موقف ہے، وہ چاہئے تو گورنمنٹ آف انڈیا ہیں کوئی عمدہ سی آسامی دلوادیتے۔ آج کچھ نہیں تو چار سو پانویس پر سخواہ ہوتی اور ٹھاٹھ کے ساتھ نئی دلی کے کسی بندگی میں برآج رہے ہوتے۔ نہ یہ تنگدستی ہوتی، نہ یہ صیبیتیں، اور نہ یہ ذلتیں! البتہ ایک بات ہے۔ مجھے زندگی کی مشکرہ دلی ہیں تجربات کے خواستے بھی بہت ملے۔ زمانے کی حقیقت آشکارا ہو گئی۔ یہ معلوم ہوا کہ دنیا میں کتنا ظلم ہے، کتنی بے انصافی ہے، کس قدر خود غرضی اور مکاری ہے اور انسانیت کے بدن کو کسی کسی بیماریاں گھن کی طرح لکھا رہی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان بیماریوں کی جڑ اور حل نبیار معلوم ہوتی۔ زندگی کا ایک روشن دمکتنا ہوا فسفہ انتہا کا جو دنیا کے گھٹا توپ انہیں سے میں روشنی کی ایک کرن کی طرح دمکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اگر بی ملے کرنے کے بعد میں کسی اعلیٰ عہدے پر مأمور ہو جانا تو یہ باتیں کہاں سے آتیں؟ اس میں شک نہیں کہ جو صیبیتیں اٹھائیں اور اٹھارا ہوں اُن سے نجح جانا اور ہر طرح کا آرام والیں ان پیش ہوتا، لیکن وہ زندگی کس قدر مصنوعی ہوتی! اوس طبقے کی خود غرضتہ زندگی! اوس طبقے کے محدود خیالات باصدیوں کی دماغی غلامی کا وجہ! آج کم از کم اتنا تو ہے کہ تاریکی اور جہالت کے اُس بوجھ سے پیرا دماغ آزاد ہے۔ مگر درست! یہ روشن خیالی کس کام کی؟ محض خیالات سے کام نہیں بنتا۔ ہو تو تم بھی اسی شیں کا ایک پردہ زہ جو

تمہارے نزدیک ایک شکنخ سے کم نہیں۔ سماج کی بیڑاں تو تمہارے پاؤں میں بھی ٹپی ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے۔ مگر میں ان بیڑوں کو کیسے توڑ سکتا ہوں؟ یہ ظفر! یہ شفقت! یہ اچھا! اور یہ رضیہ! یہ یہے ماں باپ کے نجی ہے!

اس کے خیالات روک گئے۔ سات سال پہلے کا ایک منظر متوجہ اور ناطق تعاویہ کی طرح اس کے سامنے آگیا:-

”میرے لال!

”ماں آماں!

”میرے نجی ہے!

”نکیسے آماں!

”بیٹا! تم شادی کر دینا۔ تمہارا جی بھی بھیسے گا!

”ماں آماں۔ آپ خاموش رہئے۔ ڈاکٹرنے منع کیا ہے بات کرنے کو؟

”تمہارے باپ تو اٹھ گئے؟ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرا تے ہیں۔ اب تمہارا اس

دنیا میں کون ہے؟

”آماں! ..... ” دہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر نہیں کہہ سکتا۔

”اور بیٹا! ان بچوں کو آپ کے سپرد کر دینا۔ اپنی خالکے پاس رہیں گے۔ دہ بھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔

”آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہو جائیگی۔ ردیتے نہیں، ”دہ مشکل آنسو ضبط کرتے ہوئے کہتا ہے۔

”رضیہ اتنی چھوٹی ہے۔ اس کو کون پالے گا؟“ یہ کہہ کر وہ اور بھی زیادہ رونے

لگتی ہے۔

وہ اس سال پُرانے منظر کو دیکھ کر ٹرپ اٹھا۔ اُس سال آنکھیں آنسوؤں میں تیر نے لگیں۔ منظر دھنڈ لا ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ ما فسی کی تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اُس کے خیالات کا چشمہ پھر بہ نکلا۔

”رضیتہ بہت چھوٹی ہے۔ اور اب وہ دس سال کی ہو گئی ہے۔ اُس کو اسکول میں داخل کرنا ہو گا۔ آج تک ملکیوں کو تعلیم دلانا کتنا ضروری ہے؟ اور نہ دلانا کتنا بڑا ظلم ہے! میں اُس کو ہاتھی اسکول تک پڑھاؤں گا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ وہ لکھنے پڑھنے کی لکھنی شوقیں ہے۔ الٹکیاں عام طور پر سمجھی لیسی ہوتی ہیں۔ باشوق تو لڑکے ہی ہوتے ہیں۔ ظفر، آتنا نالائق بھی کوئی کیا ہو گا! ہوش ہی ہمیں کسی بات کا کچھ سوچنے سمجھتے ہی نہیں۔ دماغ سے کام لینے کی قسم کھار بھی ہے۔ اسے بھی اکبھی تو غور کر لیا کرو اپنی حالت پر! اتنی بھی بھیجا کس کام کی! انہیں کی خاطر آج میں اٹتیں روپے پانچ آنے کی نوکری کرنے پر مجبور ہوں گے۔ میں نے اپنی آزادی کا گلہا گھونٹ دیا ہے۔ کبھی مصیبت ہے؟ لوگ مر جلتے ہیں اور دوسروں کے لئے عذاب چھوڑ جاتے ہیں۔ آخر کیا حق ہے۔ آپ کو نچے پیدا کرنے کا اگر آپ انکی مناسب تربیت اور پر درش کا انتظام نہیں کر سکتے؟ افسرمال تھے صاحب! بارہ سور روپے نخواہ پاتے تھے! اور نچے؟ نچے سوکھی روٹیاں لکھا کر گزار کرتے ہیں۔ لغت ہے تمہارے اور پرا مگر یارِ موت کی کسی خبر ہوتی ہے؟ اگر کوئی چوالیں سال کی عمر میں ناگہانی مر جائے تو اپنی اولاد کو بے آسرا چھوڑ جائے تو اس کو الزام دینا کہاں تک درست ہے؟ اُس کا اس میں

کیا قصور ہے؟ پھر کس کا قصور ہے؟ قصور کسی کا ہو، یہ بات ہے نہایت خوفناک کہ والدین کے مرنے کے بعد بچوں کی اس حد تک برپادی کا امکان ہے مادر مجھے بھی قبورت اسکتی ہے۔ میں بھی تو مرگ ناگہاں کا شکار ہو سکتا ہوں۔ اگر آج میں نہ رہوں تو کیا یہ پچھے در در بھیک نہ مان جھٹتے پھر میں؟ کیا رغبہ تیکم خلنے میں دل نہ کرادی جاتے؟ یا کسی امیر گھرانے میں جھاؤ و دینے اور بڑنے مان جھٹتے پر فکر نہ رکھ لی جائے؟ یہ کم خفت طفرا یہ تو کسی مصرف کا بھی نہیں ہے۔ بالکل ہی نکما ہے جی چاہتا ہے ایک دن ایسی ٹھکائی کر دل کہ عمر برباد کرے۔ مگر بچوں کو مارنا کیسی دخیانہ حرکت ہے؟ میں نے آج تک ان بچوں کو نہیں مارا۔ والدین کو مرے ہوئے سات آٹھ سال ہو گئے۔ اس مدت میں میں نے کبھی ان پر ہاتھ نہیں آٹھایا۔ درندے میں وہ لوگ جو بچوں کو مارتے ہیں۔ والد صاحب! —

اس کے حافظے نے بھلی کی سی سرعت کے ساتھ اپنے پوشیدہ خزانے سے ایک بمحنت  
منظر نکال رکھیں کیا:-

وہ در دارے کے باہر کھڑا ہے اور خوف کے مارے تھر تھر کا نپ رہا ہے دپلا اپنا  
منخنی سالٹ کا! باپ ڈیورڈھی میں ہے اور رانکھی میں ایک بید لشے ہوئے ہے۔  
”زادھرًا! باپ چھخ کر کہتا ہے۔

اس کے بدن میں جیسے جان رہی نہیں ہے۔ آگے بڑھنے کے لئے پاؤں اُٹھتے ہی نہیں۔

”چلانہیں!“ باپ پھر جھینتا ہے۔

وہ چیزیں کی چال سے آگے کو سر کرتے ہے۔ گویا ایک ملزم ہے جو بچانی پر لٹکایا جاتے والا ہے۔

مکدھر گیا تھا؟“

اور قبل اس کے کہ وہ کوئی جا ب دے، بید جنیش میں آ جاتا ہے، اور اس کے جسم پر صربوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔

”آدمی بخوبی تھا جانور تھا، اُس نے اپنے دل میں کہا۔“ اور آپ داشاد اللہ تعییشم یافتھے! امہندب تھے! اور ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے؛ پھری! میرے زویک توہنے سے جاہل تھے۔ گھاٹڑا درجنگی امر گئے مردود نہ فاتحہ نہ درد و باکر گئے ہمارا ستیاناں اُجھ مچھریں حصبی مکزد ریاں یا تی جاتی ہیں سب پھین کی انہیں مصیبتوں کا نتیجہ ہیں۔ اُئے دن کی جمافی نہ راہر وقت کی گھرگیاں اور ڈانٹ ڈپٹ پھوپھیں گھنٹے ایک خوف میں مبتلا رہنا۔ یہی دھچیزیں ہیں جو ایک پھر کے ذہن کو مفلوج کروتی ہیں۔ اسیں ایک شدید قیسم کا احساس کہ تری پڑا ہو جاتا ہے۔ اُجھ میں اپنے اندر خود اعتمادی گھاشائی بھی نہیں پاتا یہ مزاد مانع آزادی کیا تھے سر جن کے قابوں میں ہے۔ یہیں جو کچھ سوچتا ہوں اُس کو ضبط تحریر ہیں لانے کی جڑات نہیں رکھتا۔ اگر کبھی کچھ لکھتا بھی ہوں اُس سے دوسروں کو دلکھاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ بڑے دگوں سے ملنے میں مجھے ایک بھجک محسوس ہوتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ بڑے دگ بھی بالکل معمولی انسان سمجھتے ہیں۔ یہ ساری مکزد ریاں اُن سختیوں کا نتیجہ ہیں جو میں نے پھین ہیں باپ کے ہاتھوں پرواشت کیں۔ انہیں مکزد ریوں کی بد دلت میری زندگی بر باد ہوئی ہے۔ یہ مکزد ریاں مجھ میں نہ ہوتیں تو اُجھ میں ایک بہتر انسان ہوتا اور ہرگز اپنی ذہان کو اُنہیں روپے پانچ آنے ماہوار پر فردخت نہ کرتا۔“

اُس سے یک لخت اپنے ارد گرد کی برصغیری تاریکی کا احساس ہوا۔ اُس نے ہتھیلوں سے انکھوں کو ملا جن میں تجسسات کا انعام رکھرا ہوا تھا اور جواندھیرے میں مسلسل گھورتے رہنے کے باعث پتھر اسی گئی تھیں پھر دہ اُنہوں کھڑا ہوا۔

چار پانی پر گھٹی پڑی ہوئی تھی۔ اُس کو اٹھایا۔ ماں تھے خود بخوبی پر گلیا۔ چابی گھونٹنے لگی۔ وہ گھٹی کو جلدی سے کان کے پاس لے گیا۔ اُس میں سے بک بک کی آواز آرہی تھی۔ گویا بات صرف اس قدر تھی کہ وہ گھٹی میں چابی دینا بھوول گیا تھا۔

وہ بے اختیار مسکرا پڑا۔ معلوم نہیں یہ مسکرا بہت اُس دچکپ پ بھوول پر ایک لطیف طنز تھی یا بارہ آنے کی بچت پر دلی مسترت کا اظہار!



# گرم کوٹ

راجحہ سنگھریدیہ

میں نے دیکھا ہے: حراج الدین ٹیلر ماٹر کی دوکان پر بہت سے عمدہ عمدہ سوٹ آؤنیاں ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر اکثر میرے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہمراپنا گرم کوٹ بالکل بچپت گیا ہے۔ اور اس سال ہانغہ نگ ہونے کے باوجود مجھے ایک نیا گرم کوٹ ضرور سلوالیتا چاہیے۔ ٹیلر ماٹر کی دوکان کے سامنے سے گزرنے والے اپنے محلہ کی تصریح لکھ بیس جانے سے گزینہ کروں تو ممکن ہے مجھے گرم کوٹ کا خیال بھی نہ آئے۔ کیونکہ لکھب بیس جب متاستانگہ اور بزیر دانی کے کوٹوں کے انہیں درستہ (WORSTED) میرے سمت تجھیں پہ تازیا نہ لگاتے ہیں تو اپنے کوٹ کی بوسیدگی کو شدید طور پر محسوس کرنے لگ جاتا ہوں۔ یعنی وہ پہنچے سے کہیں زیادہ بچپت گیا ہے، ہیوی بچپوں کو پہنچ بھر دی کھلانے کے لئے مجھ سے معمولی کارک کو اپنی بہت سی غصہ دیا تھا۔ اور انہیں جگر تک پہنچتی ہوئی سردی سے بچانے کے لئے خود موٹا جھوٹا پہنچا پڑتا ہے۔ ... یہ گرم کوٹ بیس نے پارسال دہلي دروازے سے باہر پڑنے کوٹوں کی ایک دکان سے مول لیا تھا۔ کوٹوں کے سو ڈاگر نے پرانے کوٹوں کی میمنکڑوں کا نہیں کسی مراجبا ایں۔ کیونکہ کچھی کراچی سے منکوائی نہیں۔ میرے کوٹ بیس نقلی سلاک کے استر سے بنی ہوئی اند۔ دلی جیب کے نیچے مراجبا ایں کو، کالیبل اگذا ہوا تھا۔ مگر کوٹ مجھے ملا۔ بہت سستا۔ ہنگار دئے ایک بارستا

ردو شے بار بار ..... اور میرا کوٹ جہشیہ ہی پھٹا رہتا تھا۔

اسی دسمبر کی ایک شام کو تفریحِ قلب سے واپس آنے پر میں ارادتا انارکلی میں سے گزر ا۔ اس وقت میری جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا۔ آٹا دال ایندھن بجلی، بہمہ پمپنی کے بل چکا دینے پر میرے پاس وہی دس کا نوٹ بچ رہا تھا..... جیب میں دام ہوں تو انارکلی میں سے گزرنا معیوب نہیں۔ اُس وقت اپنے آپ پر غصہ بھی نہیں آتا۔ بلکہ اپنی ذات کچھ بھلی صلبی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت انارکلی میں چار دل طرف سوٹ ہی سوٹ نظر آرہے تھے اور سارہ چیزوں چند سال سے ہر ہفت خیر اسوٹ پہننے لگا ہے..... میں نے مٹا ہے گذشتہ چند سال میں کئی ٹوں سونا ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے..... شاید اسی لئے لوگ جنمائی زیبائش کا خیال بھی بہت رکھتے ہیں۔ نئے نئے سوٹ پہننا۔ اور خوب شان سے رہنا ہمارے افلس کا پریبھی ثبوت ہے۔ ورنہ جو لوگ سچ مجھ امیر ہیں۔ ایسی شان نہ شوکت اور ظاہری تکلفات کی چند اس پردا نہیں کرتے۔

کپڑے کی دکان میں درستڈ کے تھانوں کے تھان کھلے پڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ کیا میں اس مجینے کے بچے ہوئے دس روپوں میں سے کوٹ کا کپڑا خرید کر بیوی پتوں کو بھوکا مار دیں؟ لیکن کچھ عرصہ کے بعد میرے دل میں نئے کوٹ کے ناپاک خیال کا رتو حمل شروع ہوا۔ میں اپنے پرانے گرم کوٹ کا ٹین پکڑ کر اُسے بل دیئے لگا۔ چونکہ تیز تیز چلنے سے میرے جسم میں حرارت آگئی تھی اس سے موسم کی سردی اور اس قسم کے خارجی اثرات میرے کوٹ خریدنے کے ارادے کو پاٹیکیل تک پہنچانے سے قاصر ہے۔ مجھے تو اس وقت اپنادہ کوٹ بھی سرسر

تکلف نظر آنے لگا۔

ایسا کیوں ہوا؟ بیس نے کہا ہے جو شخص حقیقتاً امیر ہوں وہ ظاہری شان کی  
چند اس پر دانہیں کرتے جو لوگ سچ مجھ امیر ہوں۔ انہیں تو پھٹا ہوا کوٹ بلکہ قیصر بھی  
تلخیت میں داخل سمجھنی چاہئے تو کیا میں سچ مجھ امیر تھا کہ .....؟ .....  
بیس نے گھبرا کر ذاتی تجزیہ چھوڑ دیا اور پشكل دس کا نوٹ صحیح سلامت لئے  
گھر پہنچ گیا۔

۱۳-۹  
۵۰

شمی، میری بیوی، میری منتظر تھی۔

آنگونہ ہتھے ہوئے اس نے آگ پھونکنی شروع کر دی — کم بجت  
منگل سگھے نے اس دفعہ لکڑیاں گیلی بھیجی تھیں۔ آگ جلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔  
زیادہ پھونکیں مارنے سے گیلی لکڑیاں میں سے اور بھی زیادہ دھوآں اٹھا۔ شمی کی آنکھیں  
لال انگارہ ہو گئیں۔ ان سے پانی بننے لگا۔

کم بجت کیں کا..... منگل سگھہ "بیس نے کہا" ان پڑھنا نکھوں کے لئے  
منگل سگھہ تو کیا میں تمام دنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ ہوں .....  
بہت ٹگ دو کے بعد لکڑیاں آہستہ آہستہ چھیننے لگیں۔ آخران ہنڑا نکھوں  
کے پانی نے میرے غصے کی آگ بُجھا دی ..... شمی نے میرے شان پر سر کھا  
اور میرے پھٹے ہوئے گرم کوٹ میں پولی پولی انگلکیاں داخل کرتی ہوئی بوائی۔  
اُب تو یہ بالکل کام کا نہیں رہا۔

"بیس نے دھیمی سی آواز میں کہا" ہا۔

"سی دوں؟ ..... بیماں سے ...."

”سی دو۔ اگر کوئی ایک آدھ تار نکال کر رف کر دو تو کیا کہنے ہیں؟“

”کوٹ کو اٹھاتے ہوئے شمی بولی ڈا ستر کو تو موئی مڈیاں چاٹ رہی ہیں...“

”نقلي پیشہ کا ہے نا... یہ دیکھئے“

میں نے شمی سے اپنا کوٹ چھین لیا۔ اور کہا: ”مشین کے پاس بیٹھنے کی بجائے تم میں سے پاس ٹھیو شمی... وکھیتی نہیں ہو فتر سے آ رہا ہوں... یہ کام تم اُس وقت کر لینا جب میں سو جاؤں“

”شمی مسکرا نے لگی۔

”دہ شمی کی مسکرا بہت اور بیرا پٹھا ہوا کوٹ!“

شمی نے کوٹ کو خود ہی ایک طرف رکھ دیا۔ بولی: ”میں خود بھی اس کوٹ کی درست کرتے کرتے تھا گئی ہوں... اسے مرمت کرنے میں اس گیلے اپنے حصہ کو جلانے کی طرح جان مارنی پڑتی ہے...“

”آنکھیں فکھنے لگتی ہیں... آخر آپ اپنے کوٹ کے لئے کپڑا کیوں نہیں خریدتے؟“

”میں کچھ دیر سوچتا رہا۔“

”یوں تو میں اپنے کوٹ کے لئے کپڑا خریدنا گناہ خیال کرنا تھا۔ مگر شمی کی آنکھیں!... ان آنکھوں کو تخلیق سے بچانے کے لئے میں منگل سگھ تو کیا تمام دنیا سے چنگ کرنے پر آمادہ ہو جاؤں۔ درستہ کے تھانوں کے تھان خریدوں۔ نہنے گرم کوٹ کے لئے کپڑا خریدنے کا خیال دل میں پیدا ہوا ہی تھا۔“

”کہ پیش پامنی بھاگتی ہوئی کہیں سے آگئی۔ آتے ہی برآمدے سے میں ناچنے اور گانے لگی۔ اُس کی عرکات کھا کی مدرسے زیادہ بیعت انگیز تھی۔“

مجھے دیکھتے ہوئے پشاپمنی نے اپنا ناج اور گانا ختم کر دیا۔ بولی۔

”بابو جی آپ آگئے؟ آج ٹری بہن جی (دُستانی) نے کہا تھا۔ میز پوش کے لئے دوسروی لانا۔ اور گرم کپڑے پر کاش سکھائی جائے گی۔ گنجایا اپ کے لئے اور گرم کپڑا.....“

چونکہ اس وقت میرے گرم کوٹ خریدنے کی بات ہو رہی تھی۔ شمی نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگائی اور بولی۔

اس حجم جلی کو ہر وقت ..... ہر وقت کچھ نہ کچھ خریدنا ہی ہوتا ہے مشکل تے انہیں کوٹ سلوانے پر ارضی کر رہی ہوں .....“

وہ پشاپمنی کارونا اور میرا نیا کوٹ!

میں نے خلاف عادت اُپنی آواز سے کہا۔ ”شمی۔“

شمی کا تپ گئی۔ میں نے نعصے سے آنکھیں لال کرنے ہوئے کہا۔ ”میرے اس کوٹ کی مرمت کر دو۔ ..... ابھی ..... کسی طرح کرو۔ .....“

ایسے جیسے روپیٹ کر منگل سنگھ کی گسلی نکڑیں جلا لیتی ہو۔ ..... تمہاری آنکھیں باں بادا یا۔ ..... دیکھو تو پشاپمنی کیسے رو رہی ہے۔ پوپی بڑیا دھرا دنا۔ ....

ادھر اُد میری نجی۔ کیا کہا تھا تم نے؟ پوتو۔ .... دوسروی ہے گنجایا اپ کے لئے اور کاش سیکھنے کو گرم کپڑا؟۔۔۔ پوچھا بھی توڑ اسکل کاراگ الاتپا اور بندے کے لئے مچتا سو گیا ہو گا۔ اُسے خداوند نے دو گی تو میرا کوٹ سل جائے گا۔ ہے نا؟

.... کتنا رویا ہو گا بے چارہ۔ .... شمی اکھاں ہے بچو؟

”جی سوزا ہے۔ ....“ شمی نے سہمے ہوئے جواب دیا۔

”اگر میرے گرم کوٹ کے لئے تم ان معصوموں سے ایسا سلوک کر دیجی تو مجھے تمہاری آنکھوں کی پردہ ہی کیا ہے؟“ پھر میں نے دل میں کہا۔ کیا یہ سب کچھ میرے گرم کوٹ کے لئے ہو رہا ہے۔ شتمی سمجھی ہے یا میں سمجھا ہوں۔ پہلے میں نے کہا۔ — دونوں... مگر جو سچا ہوتا ہے۔ اُس کا تھدہ ہمیشہ اور پرہتیا ہے۔ میں نے خود ہی دبتے ہونے کہا۔

”تم خود بھی تو اُس دن کافری زنج کے مینا کار کا نٹوں کیلئے کہہ رہی تھیں...“

”ہاں... جی... کہہ تو رہی تھی مگر...“

مگر... مگر اس وقت تو مجھے اپنے گرم کوٹ کی جیب میں دس روپے کا فوٹ ایک بڑا بھاری خزانہ معلوم ہوا تھا!

دوسرے دن شتمی نے میرا کوٹ کمپیوں پر سے روکر دیا۔ ایک جگہ جہاں پر سر پڑا بانکل اڑ گیا تھا۔ صفائی اور احتیاط سے کام لینے کے باوجود سلامتی پر بد نما سلوٹیں ٹپنے لگیں۔ اس وقت معراج دین ٹیلر ماٹر کی دکان کی دکان میرے ذہن میں گھومنے لگی۔ اور یہ میرے تجھیں کی پختہ کار میں اکثر مجھے مصیبت ہیں ڈالنے کی تھی ہے۔ میں نے دل میں کہا۔ ”معراج دین کی دکان پر ایسے سوٹ بھی تو ہوتے ہیں۔ جن پر سلامتی سبیت سور دپے سے بھی زیادہ لاگت آتی ہے...“ میں ایک صہولی کارک ہوں... اس کی دکان میں لٹکے ہوئے سوٹوں کا تصور کرنا

عجیث ہے... عجیث...“

— مجھے فرصت ہیں پاک شتمی میرے پاس آ بلیٹھی۔ اور ہم دونوں خریدی جائیوں!

چیزوں کی فہرست بنانے لگے... جب ماں باپ اکٹھے ہوتے ہیں تو نیچے بھی آ جاتے ہیں... پُشا منی اور پچھا آگئے آندھی اور بارش کی طرح شور مچاتے ہوئے۔

شمی کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ یوں ہی میں نے کافر می زندگی کے مینا کار کاٹنے سب سے پہلے لکھے۔ اچانک رسوتی کی طرف ہیری نظر اٹھی۔ چوڑھے میں لکھٹی یاں دھڑ دھڑ جیل رہی تھیں..... اور ادھر شمی کی آنکھیں بھی دھمکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ معلوم ہوا کہ منگل سنگھری گیلی کر دیاں والپس لے گیا ہے۔

”وہ شہرتوت کے ڈنڈے جل رہے ہیں۔ اور کھو کھا؟... شمی نے کہا۔  
اورا اوپرے ہے؟“

”رجی ہاں، اوپرے ہے بھی....“  
”منگل سنگھری یوتا ہے..... شاید یہی عذر قریب گرم کوٹ کے لئے اچھا سادھہ خرید لوں۔ تاکہ تمہاری آنکھیں یوں نہیں چمکتی رہیں انہیں تھیف نہ ہو۔ اس ماہ کی نخواہ میں تو گنجائش نہیں..... لگے ماہ ضرور... ضرور.....“

”جی ہاں، جب سردی گذر جائے گی...“  
پُشا منی نے کئی چیزیں لکھائیں۔ دوسرویں، گنجی ماپ کے لئے گرم بیز زبرد سبز زنگ کا ایک گزر لیج، ڈی ایم سی کے گولے، گولے کی مغزی۔ اور امرتیاں اور بہت سے گلاب جامن..... موئی نے سب کچھ ہی تو لکھا دیا۔ مجھے دائمی

قبض ہتھی۔ میں چاہتا تھا کہ یونانی دو اخانہ سے اطرافیل زمانی کا ایک ڈباجی لارکھوں دودھ کے ساتھ تھوڑا سایپی کر سو جایا کر دیں گا۔ مگر موئی پیشانے اُس کے لئے گنجائش ہی کہاں رکھی ہتھی۔ اور جب پیشانی نے کہا۔ ٹکلاب جامن۔ تو اس کے منہ میں پانی بھرا آیا۔ میں نے کہا سب سے خرد ری چیز تو یہی ہے۔ ..... شہر سے واپس آنے پر میں ٹکلاب جامن دہاں چھپا دوں گا۔ جہاں ٹیکریوں میں باہر جمود را پنا دودھ کا کلسہ رکھدی پاکرتا ہے اور پیشانی سے کھوں گا کہ میں تو لانا ہی بچوں گیا۔ .... تمہارے سے لئے ٹکلاب جامن۔ ..... ادھروں۔ ..... اُس وقت اُس کے منہ میں پھر پانی بھرا آئے گا۔ اور ٹکلاب جامن نہ پاک رکھا۔ اُس کی عجیب بیفیت ہو گی۔ پھر میں نے سوچا بچو بھی تو صحیح سے خبار سے اور ٹرائیسل کے لئے ضر کردا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے آپ سے سوال کیا۔ اطرافیل زمانی۔ یہ شمی بچوں کو پیچکارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ بچو ڈی کو ٹرائیسل لے دوں گی۔ اگلے چینے۔ .... بچو ڈی سارا دن چلا یا کرے گی۔ ٹرائیسل۔ .... پوپی مٹا کچھ نہیں لے گا!

بچو چلا یا کرے گی۔ اور پوپی مٹا نہیں لے گا!

— اور میں نے شمی کی آنکھوں کی قسم کھافی۔ کہ جب تک ٹرائیسل کے لئے چھ سات روپے جیب میں نہ ہوں۔ میں نیلے گنبد کے بازار سے نہیں گزر دیں گا۔ اس لئے کہ دامن نہ ہونے کی صورت میں نیلے گنبد سے گزرنا بہت معیوب ہے خواہ نخواہ اپنے آپ پر غصہ آتے گا۔ اپنی ذات سے نفرت پیدا ہو گی۔

اُس وقت شمی بھی آئینے کی بیضوی ٹکڑی کے سامنے اپنے کافری اسپید سوٹ میں کھڑی تھی۔ میں چُکپے سے اُس کے چیچے جا کھڑا ہوا اور کھنے لگا۔ میں

بناوں تم اس وقت کیا سوچ رہی ہو؟"

بناوں تو جانوں.....

"تم کہہ رہی ہو۔ کافوری سپید سوٹ کے ساتھ دہ کافوری زنگ کے مینا کار  
کا نتھے پن بگر ضلع دار کی بیوی کے ہاں جاؤں تو زنگ رہ جائے....."

ہمیں تو شمی نے ہفتے ہوتے کہا۔ آپ میری آنکھوں کی تعریف کرتے  
ہیں۔ یہیں نے کہا دیکھوں تو ان یہیں کیا دھرا ہے..... بھی بات تو یہ ہے کہ اگر  
آپ سچ مجھ میری آنکھوں کے مذاح ہوتے تو کبھی ناگرم....."

یہیں نے شمی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میری تمام خوشی بے بی ہیں پہل گئی ہیں  
نے آہستہ سے کہا "بیس..... دھر دیکھو..... لگے جیلنے —

ضرور خرید لوں گا....."

"رجی ہاں، جب سردی .....

— پھر ہیں اپنی اس صیئن دُنیا کو جس کی تخلیق پر مخفی دس روپ پر صرف ہوتے  
ہتھے تصور ہیں بازار چلا گیا۔

میرے سوا انمار کلی ہیں سے گذر نے والے ہر ذی خوت آدمی نے گرم سوٹ پن رکھا  
تخلیلا ہو کے ایک لمحہم شحیم صنبلہ میں کی گرد دن نکٹائی اور تخلیقت کا لکر کے سبب میرے  
چھوٹے بھائی کے پال تودہ ملی گئے "مانیگیر" کی گرد دن کی طرح اکٹی ہوئی تھی ہیں نے  
ان سوٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لوگ سچ مجھ بہت مغلس ہو گئے ہیں..... اس جیلنے نامعلوم کہتا سونا

چاندی بھار سے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ کاٹوں کی دکان پر میں نے کئی جوڑیاں کاٹنے دیجھے۔ اپنی تھیں کی نچتہ کاری سے میں شہمی کی کافری سپید سوت میں بلوس ذہنی تصویر کو کاٹنے پہنا کر پسند یانا پسند کر لیتا۔۔۔ کافری سپید سوت۔۔۔ کافری مینا کار کاٹنے۔۔۔ کثرت اقسام کے باعث ان میں سے پس ایک بھی ناخوب نہ کر سکا۔

اُس وقت بازار میں مجھے یزداني مل گیا۔ وہ نظر تھی کلب سے جو درصل پریل کلب تھی۔ پسند رہ رہ پے جیت کر آیا تھا۔ اُس کے چہرے پر اگر مرخی اور بشاشت کی لمحیں دکھائی دیتی تھیں۔ تو کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ میں ایک ہاتھ سے اپنی جیب کی سلوٹوں کو چھپا نے لگا۔ نخلی باٹیں جیب پر ایک روپے کے بربر کوٹ ملتے ہوئے رنگ کا پیوند بہت ہی ناموزد دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ میں اُسے بھی ایک ہاتھ سے چھپا تارہ۔ پھر میں نے دل میں کہا۔ کیا عجب یزداني نے میرے شانے پر ہاتھ دکھنے سے پہلے میری جیب پر کی سلوٹیں اور وہ رہ پے برابر کوٹ کے رنگ کا پیوند دیکھ لیا ہو۔۔۔ اس کا بھی رد عمل شروع ہوا اور میں نے دلیری سے کہا۔

مجھے کیا پر فا ہے۔۔۔ یزداني مجھے کو نسی تھیں بخش دیگا۔ اور اس میں بات ہی کیا ہے۔ یزداني اور سنتا سنگھ نے بارہ مجھ سے کہا ہے کہ وہ رفتہ ذہنی کی زیادہ پر عاد کرتے ہیں اور رفتہ ذہنی کی کم۔

مجھ سے کوئی پوچھے ہیں وہ رشدگی زیادہ پردا کرما ہوں۔ اور رفتہ ذہنی کی کم!

یزداني خصت ہوا اور جیب تک وہ نظر سے اوچھیل نہ ہو گیا۔ میں عنز سے اُس

کے کوٹ کے نیس درست کو پشت کی جاتب سے دیکھتا رہا۔

پھر میں نے سوچا کہ سب سے پہلے مجھے پشا منی کیلئے گلاب جامن اور امرتیاں خریدنی چاہتیں۔ کہیں دلپسی پر سچ مجھ بھول ہی نہ جاؤ۔ لگھر پنچکر انہیں چھپانے سے خوب تماشا رہیگا۔ مٹھائی کی دکان پھولنے توہرے روغن میں کچوریاں خوب بھول رہی تھیں۔ میرے منہ میں پانی بھرا آیا۔ اس طرح جیسے گلاب جامن کے تختیل سے پشا منی کے منہ میں پانی بھرا آیا تھا۔ قبض اور اخراجیل زمانی کے باوجود میں سفید بخپڑ کی میز پر کھنیاں ٹکا کر سبب بعہدت کچوریاں کھانے لگا.....

ہاتھ دھونے کے بعد جب پسیوں کے لئے جیب ٹھوٹی تواس میں کچھ بھی نہ تھا۔

وس کا نوٹ کہیں گر گیا تھا!

کوٹ کی اندر ونی جیب میں ایک ٹرائیورا خ ہو رہا تھا۔ نقلی لشیم کو ٹڑیاں چاٹ گئی تھیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے پر اس جگہ جہاں مرانجا، مرانجا اینڈ کا لیبل لگا ہوا تھا میرا تھہ بامہر نکل آیا۔ نوٹ دہیں سے باہر گرد گیا ہو گا۔

ایک لمحہ میں میں یوں دکھاتی دینیے لگا جیسے کوئی بھولی سی بھیرا پنی خوبصورت لشیم اُتر جانے پر دکھاتی دینے ملتی ہے۔

حلوائی بھانپ گیا۔ اور خود ہی بولا۔ کوئی بات نہیں باوجھی۔ .. پسیے کل آجائیں گے۔ میں کچھ نہ بولا۔ .. کچھ بول ہی نہ سکتا۔

صرف اظہارِ شکر کے لئے میں نے حلوائی کی طرف دیکھا۔ حلوائی کے پاس ہی گلاب جامن چاٹنی میں ڈوبے پڑے تھے۔ روغن میں بھولتی ہوئی کچوریوں کے

وھوئیں میں اسے آتشیں سُرخ امرتیاں جگہ پر داغ لگا رہی تھیں ..... اور ذہن میں پُشپا منی کی وھندلی سی تصویر پھر گئی۔

میں دہاں سے بادامی باغ کی طرف چل دیا اور آوھ پون گھنٹہ کے قریب بادامی باغ کی رویے لائن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس عرصہ میں حنکش کی طرف سے ایک مال کاڑی آئی۔ اس کے پانچ منٹ بعد ایک شفت کرتا ہوا انہیں جس میں سے دھکتے ہوئے سُرخ کوٹھے لائن پر گردہ ہے تھے — تمہارُ دقت قریب ہی کی سالٹ ریفائلزی میں سے بہت سے مزدور اور ٹائم لگا کر داپن لوٹ رہے تھے ..... میں لائن کے ساتھ ساتھ دریا کے پل کی طرف چل دیا۔ چنانی رات میں سردی کے باوجود کالج کے چند منچے نوجوان کشتی چلا رہے تھے۔

”قدرت نے عجیب سزادی ہے مجھے“ میں نے کہا پُشپا منی کیلئے گوٹے کی مغزی، دوسوتی، گلاب جامن اور شمی کے لئے کافری یعنی کارکانٹے خریدنے سے بھی بڑھ کر کوئی گناہ سرزد ہو سکتا ہے کس بے رحمی اور بے دردی سے میری ایک حیین مگر بہت سستی دنیا بر باد کر دی گئی ہے ..... جی تو چاہتا ہے کہ میں بھی قدرت کا ایک شاہ کار قڑ پھوڑ کے رکھ دوں۔

— مگر پانی میں کشتی ران لڑ کا کہہ رہا تھا۔

اس موسم میں تواردی کا پانی گھٹنے گھٹنے سے زیادہ کمیں نہیں ہوتا ”سالاپانی تو اُدپر سے اپر باری دداب لے لیتی ہے ..... اور یوں بھی آجکل پھاڑوں پر برف نہیں سمجھلتی ..... دوسرے نے کہا۔“ میں ناچار گھر کی طرف لوٹا۔ اور نہایت بے دلی سے زنجیر ملاٹی۔

میری خواہش اور اندازے کے مطابق پُشا منی اور بخونخا بہت دیر ہوتی۔  
ولہیز پہ سے اٹھ کر بستردیں ہیں جا سوئے تھے شمی چوڑھے کے پاس شستوت کے نیم جان  
کو ملاں کرتا پتی ہوتی کئی مرتبہ اونگھی اور کئی مرتبہ چونگھی تھی۔ وہ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر  
ٹھٹک گئی۔ اُس کے سامنے ہیں نے چور حب کے اندر ہاتھ ڈالا اور لیں کے نیچے  
سے نٹاں دیا۔ شمی سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ ... کچھ بول ہی نہ مسکی۔  
ہیں نے کوٹ کھوٹی پر لٹکا دیا۔ میرے پاس ہی دیوار کا سماں الیکٹریٹی بیٹھ گئی۔  
اور سہم دنوں ہوتے ہوئے پھوں اور کھوٹی پر لٹکے ہوئے گرم کوٹ کو دیکھنے لگے۔  
اگر شمی نے میرا انتشار کئے بغیر دہ کافوری سوت بدال دیا ہوتا تو شام میری حالت  
آنئی متغیر نہ ہوتی۔

بزرگی اور سنتا سنگھ تفریح کلب میں پریل کھیل رہے تھے۔ انہوں نے دود دہینے بن  
گھوٹ پی بھی رکھی تھی۔ مجھ سے بھی پینے کے لئے اصرار کرنے لگے۔ مگر میں نے انکار  
کر دیا۔ اس لئے کہ میری حب میں دامن تھے سنتا سنگھ نے اپنی طرف سے ایک  
آدھہ گھوٹ زبردستی مجھے بھی پلا دیا۔ شاید اس لئے کہ وہ جان سکتے تھے کہ اس کے  
پاس پیے نہیں ہیں۔ یا شاید اس لئے کہ وہ رفتہ ذہنی کی درستی سے زیادہ پڑا کرتے تھے  
اگر گھر میں اُس دن شمی کو وہی کافوری سپید سوت پینے ہونے دیکھ کر نہ آتا تو  
شاید پریل میں قسمت آزمائی کرنے کو میراجی بھی نہ چاہتا۔ میں نے کہا کاش! میری حب  
میں ایک دو روپے ہوتے تو کیا عجائب خنا کہ میں بہت سے دو سپے بنا لیتا۔  
مگر میری حب میں محل پونے چار آنے تھے۔

بزدا فی اور سنتا سنگو نہایت عمدہ درست کے سوت پہنے نیک عالم کلب کے سکرٹری سے بھیگاڑ رہے تھے نیک عالم کہہ راتھا کہ وہ تفریح کلب کو پریل کلب اور ربار اپنے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس وقت میں نے ایک مایوس آدمی کے خصوص انداز میں جیبیں ہاتھ دالا اور کہا: ”یوں پھوں کے لئے کچھ خریدنا قدرت کے نزدیک گناہ ہے۔ اس حساب سے پریل کھیلنے کے لئے تو اسے اپنی گردہ سے دامدے دینے چاہئیں۔ ہی ہی..... غنی غنی.....“

اندر ونی کیسے..... بائیں نجی جیب..... کوٹ میں پشت کی طرف مجھے کوئی کاغذ سرکسا ہوا معلوم ہوا۔ اسے سرکاتے ہوئے ..... میں نے دائیں جیب کے سوراخ کے نزدیک جائز کالا۔

— دہ دس روپے کا نوٹ تھا۔ جو اس دن اندر ونی جیب کی تھے سوراخ میں سے گزر کر کوٹ کے اندر ہی اندر گم ہو گیا تھا!

اُس دن میں نے قدرت سے انتقام لیا۔ میں اُس کی خواش کے سطابی پریل دریل نہ کھیلا۔ نوٹ کو مٹھی میں دبائے گھر کی طرف بھاگا۔ اگر اس دن میرا انتشار کئے بغیر شرمی نے وہ کافری سوت بدل دیا ہوتا۔ تو میں خوشی سے یوں دیوانہ کبھی نہ ہوتا۔ ہاں پھر جپنے لگا وہی تخلیقیں کا دار۔ گویا ایک حسین سے حسین دُنیا کی تخلیق میں دس روپے سے اُپر ایک دمڑی بھی خرچ نہیں آتی جیب میں بہت سی چیزوں کی فہرست بنارہاتھی نے بیرے ہاتھ سے کاغذ چھپیں کہہ پُر زے پُر زے کے کرو یا اور یوں۔

۱۰ تھے قلعے مت بنائیں..... پھر نوٹ کو نظر لگ جائے گی ॥

”شمی ٹھیک کہتی ہے۔ میں نے سوچتے ہوتے کہا۔ نہ تمہیں اتنا زیگین ہوا اور بخوبی سے سے اتنا دکھ پہنچے۔“

پھر میں نے کہا۔ ایک بات ہے شمی! مجھے قہر کیس میں مجھ سے گم نہ ہو جائے۔۔۔ تھہاری کھیمو دڑپروں، بازار جا رہی ہے۔ اُس کے ساتھ جا کر تم یہ سب چیزیں خود ہی خرید لاؤ۔۔۔ کافوری مینا کار کا نہیں۔۔۔ ڈی ایم سی کے گولے، مغزی اور ویکھو پوپی مٹا کے لئے گلاب جامن ضرور لانا۔۔۔ صفر۔۔۔ شمی نے کھیمو کے ساتھ جانا منتظر کر لیا۔ اور اُس شام شمی نے کشیرے کا ایک نایاب عمدہ سوت پہنا۔

پھوٹ کے سور دخوغاس سے میری طبیعت بہت گھبرا تی ہے۔ مگر اس دن میں عرصہ تا بپھوٹ نہیں کو اُس کی ماں کی عیز حاضری میں بہلا تا رہا۔ وہ رسوئی سے ایندھن کی کوکی غسل خانے نیم حصہ پر۔ بجگہ اُسے ڈھونڈتا پھرا میں نے اُسے پچکا رئے ہوئے کہا۔

وہ ٹرائیکل یتھے گئی ہے۔۔۔ نہیں جانے دو۔ ٹرائیکل گندی چیز ہوتی ہے۔ اخ ہتو۔۔۔ خبرہ لائے گی، بھی فی تھہارے لئے بہت خوبصورت خبارہ۔۔۔“ پھوٹ پیٹھی نے میرے سامنے ہٹک دیا۔ بولی، آے۔۔۔ ای۔۔۔ گندی۔۔۔

میں نے کہا۔ کوئی دیکھئے تو۔۔۔۔۔۔ کیسا ہیں یوں سامیٹا ہے۔ پُشا منی کو بھی میں نے گو دیں لے لیا اور کہا۔ پوپی مٹا۔۔۔۔۔۔ آج گلاب جامن جی بھر کر کھلتے گانا!۔۔۔۔۔۔

اُس کے منہ میں پانی بھرا آیا۔ وہ گو دی سے اتر پڑی ابو لی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔

..... جیسے ایک بڑا سا گلاب جامن کھا رہی ہوں ۔

پھر دنارہ پشا منی کھتا کلی مدرے سے زیادہ جیں ناج بر آئے میں ناچستی رہی۔  
جیسے میرے تخیل کی پرداز سے کون روک سکتا تھا۔ کہیں میرے تخیل کے قلعے زیں  
پر نہ آ رہیں۔ اسی ڈر سے تو میں نے شمی کو بازار بھیجا تھا۔ میں سچ راتھا۔ شمی اب  
گھوڑے ہسپتال کے قریب پنج چکی ہو گی۔ .... اب کانچ روڈ کی نکڑ پر ہو گی۔  
اب گندے انجن کے پاس ۔ ۔ ۔ ۔

ادر ایک نہایت دھیکے انداز سے زخمی ہلی۔

شمی پنج آگئی تھی۔ درداز کے پر۔

شمی اندر آتے ہوئے بولی۔ ”میں نے درد پر کہیو سے اُدھار لے کر  
بھی خرچ کر ڈالے ہیں“

”کوئی بات نہیں“ میں نے کہا۔

پھر زچہ، پوپی مُنا اور میں تینوں شمی کے آگے پچھے گھومنے لگے۔

مگر شمی کے ہاتھ میں ایک بندل کے سوا کچھ نہ تھا۔ اُس نے میز پر بندل کھولا  
— وہ میرے کوٹ کے لئے بہت نفیس درستہ تھا!

پشا منی نے کہا۔ ”بی بی، میرے گلاب جامن.....“

شمی نے زور سے ایک چپت اُس کے منہ پر لگادی!